U S. - 4.97

26/3/97

Overdue charges will be levied under rules for each day if the book is kept beyond the date stamed above.

30333
13.11.59

به سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نمبر ۲۲۱

انتخابِ ذوق و ظفر

(۱) انتخابِ ذوق مع مقدمہ

از

جناب علامہ پنڈت برج موہن کیفی صاحب دتاتریہ

(۲) انتخابِ ظفر مع مقدمہ

از

جناب سید شان الحق صاحب حقی ایم۔ اے

شائع کردہ

انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی

پہلی بار ۱۹۴۵ء قیمت مجلد سے، قیمت بلا جلد عـ

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) نمبر ۲۲۱

انتخاب ذوق وظفر

(۱) انتخاب ذوقؔ مع مقدّمہ

از

جناب علامہ پنڈت برج موہن کیفیؔ صاحب دتاتریہ

(۲) انتخاب ظفرؔ مع مقدّمہ

از

جناب سید شان الحق صاحب حقیؔ ایم۔اے

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) دہلی

پہلی بار ۱۹۴۵ء (قیمت مجلد سے۔ بلا مجلد عہ)

پیش لفظ

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ادب معاشرت کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے - ایک جماعت کے ایک عہد کے ادب میں وہ چیزیں تلاش کرنا جن کا وجود یا جن کے اوصاف کے تناسب اوصاف کا وجود اس کی معاشرت میں نہ تھا، تحقیق کی از خود رفتگی اور انتقاد کی ستم ظریفی ہے - افسوس ہے کہ عہدِ ماضی کے ادب پر نظر ڈالتے ہوئے اکثر اس اصول کو بھلا دیا جاتا ہے - دو حقیقتیں اور ہیں جنھیں ذہن نشین رکھنا چاہیے :-
ایک یہ کہ ذوق، طرزِ ادا اور ان کے نتیجے میں تخیل تھوڑے بہت بدلتے رہتے ہیں - اس تغیّر کے اسباب کبھی داخلی اور اکثر خارجی ہوا کرتے ہیں اور دوسری یہ کہ ادب خاص کر شاعری شاعری نہیں رہتی اگر روایات اور داخلیت کو قطعاً مسترد کر دیا جائے۔

جو طبیعتیں اتنی بغاوت پسند واقع ہوئی ہیں کہ ان امور کو توجہ کے قابل نہیں قرار دیتیں جن کا ابھی مجمل ذکر ہوا، ان کے لیے میرؔ اور سوداؔ - کیا حالیؔ اور داغؔ و امیرؔ اور اقبالؔ و چکبستؔ کے کلام کی تمام جلدوں کو دریا بُرد یا آگ کے سپرد کر دینا بہت معمولی بات ہے -

ایک ادیب اور شاعر کی جگر کاویوں کی اقدار اور وقعت کا اندازہ صرف عہدِ حاضر کے ماحول اور ضروریاتِ زندگی یا اس کے شاعروں اور ادیبوں کے ذاتی تجربات کے معیار سے کرنا ناانصافی ہی نہیں بلکہ معقولیت سے خارج ہے اور پھر ان کی نظر بھول کر بھی اس طرف نہیں جاتی کہ جس شاعر کو وہ اپنے تازہ معلوم معیار سے گرا ہوا پاتے ہیں، اس نے اپنے وقت میں زبان اور اسلوبِ بیان

کی کتنی خدمت کی۔ وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر اگلے لوگ زبان کو مانجھ سنوار کر ایسا مکمل نہ بنا جاتے تو ہم آج فرائڈ اور ایلیٹ کے قول کس طرح اُس میں تعبیر کر سکتے۔

اُس شاعر کی شاعری اس کی زندگی ہی میں مر جاتی ہے جس نے نہ زبان کی خدمت کا حق ادا کیا اور نہ سماج کے خیالات پر اچھا اثر ڈالا۔ واضح رہے کہ جو کچھ اب تک کہا گیا اس سے اعتقادی اور ملّی شاعری بے تعلق ہیں۔ جب ہم اس معیار پر ذوقؔ کے کلام کی جانچ کرتے ہیں تو اسے اس کے معاصرین مثل غالبؔ۔ مومنؔ، ناسخؔ اور آتشؔ وغیرہ کے کلام سے جدا اور ممتاز پاتے ہیں۔ امتیاز کی وجہ وہ خارجیت ہے جو داخلیت کا ہلکا سا رنگ لیے ہوئے ذوقؔ کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نظیرؔ کے علاوہ جس کا میدان سب سے الگ ہے، ذوقؔ کے برابر لاشعوری تخیل اور خارجیت سے کسی اور نے واسطہ نہ رکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

ای ذوقؔ دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

فرطِ ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے
ہی یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

ای ذوق تکلف میں ہی تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہی جو تکلف نہیں کرتا

تو بھلا ہی تو برا ہو نہیں سکتا ای ذوق
ہی برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہی
اور اگر تو ہی برا ہی تو وہ سچ کہتا ہی
کیوں برا کہنے سے تو اس کے برا مانتا ہی

آدمیت اور شی ہی علم ہی کچھ اور چیز
کتنا توتے کو پڑھایا پھر بھی حیواں ہی رہا

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہی جو بن کھلے مرجھا گئے

ای ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہی ملاقاتِ مسیحا و خضر سے
گل ہائے رنگ رنگ سے ہی زینتِ چمن
ای ذوق اس جہاں کی ہی زیب اختلاف سے

زبان کی خدمت کے ثبوت میں اشعار نقل کرنا طولِ امل ہے۔ سب کو اقرار ہے کہ اُدھر ناسخ اور اس کے گروہ کی لغات پرستی اور آتش کی جذبات کی شورش کے اور اِدھر غالب کی تخیل میں ہوا بازی اور مومن کی تخییلی پچی کاری سے بوجھ کے نیچے اُردو زبان ادبی اقدار میں پست مایہ ہوتی جاتی تھی اور فصاحت کی حیثیت زوال کے کھڈ کی طرف لڑھکتی جارہی تھی کہ ذوق نے اسے چند بے کار اور مہمل خیالات کا گورکھ دھندا ہونے سے بچایا اور قصیدے کی صنف کو تو اس معراج پر پہنچا دیا جس کے آگے لے جانے کا خیال، اگر کسی کو ہو تو سودا ہے۔ اُردو میں قصیدہ مرزا رفیع سے شروع ہو کر شیخ ابراہیم ذوق پر ختم ہو گیا۔

فصاحت اور سلاست ہی ذوق کے کلام کا طرّۂ امتیاز نہیں، وہ اپنے اسلوب کو جس خوبی اور سلیقے سے تشبیہ اور استعاروں سے سجاتا اور کلام میں گیرائی پیدا کرتا ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ فنیت پر اس کی قدرت حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ ذوق جس دنیا میں تھا اس کا اسے پورا احساس تھا اور وہ اپنے ماحول کو اپنی ذہنیت کے رنگ سے متاثر کرنا چاہتا تھا

ذوق نے بہت کچھ کہا لیکن افسوس ہے کہ اس کے کلام کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ء کی لوٹ مار میں ضائع ہو گیا۔ آخر ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں ذوق کے شاگردوں (حافظ غلام رسول ویراں، امراؤ مرزا انور اور سید ظہیرالدین ظہیر) نے پہلی دفعہ دیوان ذوق شائع کیا جو دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تھا۔ اس میں ۱۵۷ صفحے غزلوں کے ہیں، ۴۶ صفحوں میں قصیدے وغیرہ ہیں۔ اسی نسخے کی نقلیں جگہ جگہ بار بار چھپتی رہیں۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ محمد حسین آزاد جو ذوق کے اتنے بڑے مدّاح اور بچپن سے استاد ذوق سے خاص اور نہایت قریبی تعلق رکھنے والے تھے،

ان کے باپ نے ۱۸۳۶ء سے اُردو کا مطبع کھول رکھا تھا، جہاں سے ان کا سب سے پہلا اُردو اخبار نکل رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے برسوں پہلے آزاد اپنے باپ کے مذکورہ مطبع کا انتظام کرتے تھے چناں چہ جامع فتح خانی کا ترجمہ جو ان کے مطبع میں چھپا، اس کے لوح پر یہ عبارت چھپی ہوئی ہے:-

"دہلی اردو اخبار پریس مکان باجورہ متعلقہ امام باڑہ وقفی مولوی محمد باقر صاحب میں بہ اہتمام بندہ محمد حسین پرنٹر و پبلشر کے دوسری بار چھاپہ ہوا۔ ۱۸۴۹ عیسوی۔"

ذوق کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوتا ہے یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تقریباً تین برس پہلے۔ یہ سوال ضرور معقول ہے کہ جب آزاد کو استاد ذوق سے اتنی خصوصیت اور عقیدت تھی اور بیس برس سے آزاد کے گھر میں مطبع تھا جس میں اخبار اور کتابیں چھپتی تھیں تو اس نے اپنے محبوب استاد کا کلام اپنے مطبع میں کیوں نہ چھاپا۔ فرض کیجیے، ذوق نے اجازت نہ دی۔ لیکن ذوق کے انتقال کے تین برس بعد تک آزاد کے گھر کا مطبع قائم رہا۔ ان تین برسوں میں ذوق کا کلام مکمل کلیات کی صورت میں کیوں شائع نہ کیا گیا۔ حافظ ویران والے نسخے کی ترتیب میں بھی آزاد نے کوئی حصہ نہ لیا۔ اس کا جواب اب کون دے۔

ہوا تو یہ ہوا کہ جب آزاد لاہور میں بیٹھ کر اور نیرنگ خیال اور آب حیات لکھ کر ادب میں اپنی جگہ بنا چکے تو انھوں نے دیوان ذوق کا ایک نسخہ شائع کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بہتر تھا کیوں کہ اس کے اور اس سے پہلے کے اڈیشن میں جو اختلاف لفظی وغیرہ ہیں، وہ آزاد کے ذوق سخن کے خلاف چغلی کھاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

قدیم اڈیشن	آزاد کا اڈیشن
۱- ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں	۱- وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں
۲- آدمیت سے ہی بالا آدمی کا مرتبہ پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو	۲- دستِ ہمت سے ہی بالا آدمی کا مرتبہ
۳- اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی الفت کا نام اگلے مکتوبوں میں کچھ رسمِ کتابت ہو تو ہو	۳- اگلے مکتوبوں ہیں کچھ اس سے کتابت ہو تو ہو
۴- اس بت کدے میں کون ہی کافر ترے سوا تو آپ ہی بت پرست و بت و بت تراش ہی	۴- تو بت پرست بت بھی ہی اور بت تراش ہی
۵- میت کو غسل دیجیو نہ اس خاکسار کی ہی تن پہ خاک کوچۂ دلبر لگی ہوئی	۵ ہی تن کو خاک کوچۂ دلبر لگی ہوئی
۶ (ندارد)	۶- دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا جہاں دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے
۷- ابر تر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے برقِ مضطر تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے	۷- ابر کیا آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے برق کیا ہی تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
۸- کھل سکے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہی جو بن کھلے مرجھا گئے	۸- گل کھلا کچھ تو بہاریں اپنی صبا دکھلا گئے
۹ مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کے لیے سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے [لہ]	۹ مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کے لیے یہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

لہ آبِ حیات میں بھی یہ شعر اسی طرح لکھا ہی۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ ۲۳ راگست ۱۷۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۶ رنومبر ۱۸۵۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ عمر بھر دلی میں رہے۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ ذوقؔ نے شاعری میں شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لی۔ بہادر شاہ ظفر شہزادگی کے زمانے ہی سے ذوقؔ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کی بارگاہ سے ذوق کو ایک قصیدے کے اعتراف میں خاقانی ہند کا خطاب عطا ہوا۔

۲۵ رجولائی ۱۹۴۲ء　　　　برج موہن دتاتریہ کیفی

ا

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروف رقم میرا　　الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا
ہوا روشن چراغ کعبہ زاہد جس کے شعلے سے　　اسی آتش کا رکھتا ہے شرر سنگ صنم میرا

شوق نظارہ ہے جب سے اس رخِ پر نور کا　　ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمع طور کا
اس نزاکت پر نظر کرنا کہ وہ رشکِ پری　　بال بھی باندھے جو ستے پر تو زلفِ حور کا
عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا　　لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

لکھیے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا　　پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا
آتی ہے صدائے جرسِ ناقہ لیلا　　پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
پردہ در کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں　　پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا
دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ　　کچھ فائدہ بے دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا

نام منظور ہو تو فیض کے اسباب بنا ‏ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا
سرِ مژگانِ چشمِ عزیزاں نہ بنا ئیں ای چرخ ‏ کیا بنا خاک، غبارِ دلِ احباب بنا
تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ ‏ اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُرآب بنا
آہ کے ساتھ جو نکلا شررِ آتشِ دل ‏ چرخ پر جا کے وہ خورشیدِ جہاں تاب بنا

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا ‏ اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا ‏ فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام ‏ خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
سراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے ‏ کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم ‏ کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے ‏ خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا
مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے ‏ فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا ‏ جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا
میرے نالوں سے جو پانی سنگِ خارا ہو گیا ‏ کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا
دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے ‏ مئیں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارہ ہو گیا
ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار ‏ پر امیدِ وصل پر برسوں گوارا ہو گیا
ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ ‏ ہو گیا جس طرح کوئی دم گزارا ہو گیا
ظلمتِ عصیاں سے میرے بن گیا شب روزِ حشر ‏ آفتاب اک نیزے پر دم دار تارا ہو گیا
ذوقؔ اس بحرِ فنا میں کشتیِ عمرِ رواں ‏ جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آ پہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

آنے سے مرے ٹھیر گئے آپ وگرنہ
جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکم ازلی ذوق یونہیں ہو ہی چکا تھا

محفل میں شورِ قلقلِ مینائے مُل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُتل ہوا

دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لوہے کا پُل ہوا

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزو ضعیف محرم اسرار کُل ہوا

اس تپش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بہ قدم دل ہوتا

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تل ہوتا

موت نے کردیا ناچار وگرنہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

سینۂ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِ راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

اس نے جب مال بہت ردو بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

اجل آئی نہ شبِ ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

دل کو اس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

شہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دل مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینے میں غم سے
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ ناجی سے کوئی جائے
جب تک نہیں آتا اسے غصہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا
تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

شب ہم نے تہیہ جو کیا توبہ کا ساقی
مغرب سے سحر مہر درخشاں نکل آیا

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہرِ مقصود
دریا سے تہی پنجۂ مرجاں نکل آیا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

نہ کیوں تیرے دانتوں سے جھوٹا ہو موتی
کہ دعوا کیا تھا صفائی کا جھوٹا

بناتا ہے آئینِ الفت میں تجھ کو
یہ شیوہ تری بے وفائی کا جھوٹا

مجھے نعمت خلد ہووے جو پاؤں — ترے در پہ ٹکڑا گدائی کا جھوٹا
خدا جانے ہو ذوق جھوٹا کہ سچا — نہیں ہو وے آشنائی کا جھوٹا

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں — کانٹا سمجھیے سیہ کا یا گل کنیر کا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں — کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا
ہو موج بحر عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ — بے چارہ مشت خاک تھا انسان بہ گیا
تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن — پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

ہو قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہو ان دنوں صیاد کا
کچھ گداز عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے — کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا
پس ہوں چکر میں لگی جب زن سے دنیا کی ہوا — حال میرا ہو بعینہ آسیائے باد کا
سلسلے میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی — ابجد عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

مرے سینے سے تیرا تیر جب اے جنگ جو نکلا — دہان زخم سے خوں ہو کے حرف آرزو نکلا
مرا گھر تیری منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع — خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا
ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا — رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا
کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا — پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا
خجل اپنے گناہوں سے بہت تھی یاں تک کہ جب رویا — تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا
اسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو — جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

غیروں سے دیکھ دیکھ تری گرم جوشیاں
میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

عالم ہو زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہو پھول آفتاب کا
ٹپکے اگر عرق گلِ رخسار سے ترے
دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں بھوڑا اٹکا
چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا
توسنِ عمر رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا
کبھی میدان فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا
بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح
سامنے تیرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اٹکا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہو کیا ہم سے گنہگاروں کا
محتسب گرچہ دل آزار ہو مے خواروں کا
دیجے اک جام تو ہو یار ابھی یاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں دل ہووے گرفتار کہ زلف
جیل خانہ ہو محبت کے گرفتاروں کا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا
دیکھ چھوٹوں کو ہو اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہو دکھائی دیتا
لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے ، مگر
ایک تیرا نہ مجھے درد جدائی دیتا
روش اشک گرا دیں گے نظر سے اک دن
ہو ان آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا
میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا
دیکھ گر دیکھتا ہو ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہو دکھائی دیتا

جھوٹا ہی جانو کلام اس رہزنِ ایمان کا پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا
تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید تو ہماری جان لیکن کیا بھروسا جان کا
جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہی انسان بھی پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہی انسان کا
نفسِ بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی دیکھ پھر سامان اس فرعونِ بے سامان کا

کسی بے کس کو ای بیداد گر مارا تو کیا مارا جو آپی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا اگر پارے کو ای اکسیر گر مارا تو کیا مارا
نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا
تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہی مثلِ قلقلِ مینا کسی نے قہقہہ ای بے خبر مارا تو کیا مارا
جگر زخمی ہی اور دل ٹوٹتا ہی، تم نے کیا جانے اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا
دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب ای کوہکن پہنچے اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا کیا مارا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپایدار کا چشمک ہی برق کی کہ تبسم شرار کا
ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا
ہو پاک دامنوں کو خلش گر سے کیا خطر کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا
ہو دل کی داد گھات میں مژگاں سے چشمِ یار کرتی ہی قصد ٹٹی سے اوجھل شکار کا
اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق گویا کہ اک ستارہ ہی صبحِ بہار کا
ای ذوق ہوش گر ہی تو دنیا سے دور بھاگ اس مے کدے میں کام نہیں ہوشیار کا

کسی کے رُخ پہ ہی جو گئی جو چشمِ مہ وزاد
تو اس کے گھیرے ہیں مژگان بال کے کیسا

شبِ فراق میں اس مہ جبیں کے انجمِ چرخ
مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے کیسا

میں کہاں سنگِ درِ یار سے ٹل جاؤں گا
کیا وہ پتھر ہی پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

سرد مہروں سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ
نخل سرما زدہ کی طرح سے جل جاؤں گا

اس سے تو اور آگ وہ بے درد ہو گیا
اب آہِ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سو بار مر کے عاشقِ جاں باختہ ترا
لڑنے کو پھر کھڑا روشِ مرد ہو گیا

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانندِ گرد باد
جب خاک اُڑائی ہم نے تو وہ گرد ہو گیا

پانی طبیب دے گا ہمیں کیا بجھا ہوا
ہو دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتابِ قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغِ داغِ دل اپنا بجھا ہوا

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا مرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوقؔ نہ پایا بجھا ہوا

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے موذن جدا خطیب جدا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر
نہ کر سکا مرے دل سے غمِ حبیب جدا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوقؔ
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

نہ رکھی خوبی وزشتی سے غرض آئینہ وار
گھر میں مہمان جسے اہلِ صفا نے رکھا

نہ گیا مر کے بھی اس مصحفِ رخسار کا شوق
کہ رہا گور پہ قرآن سرہانے رکھا

نشۂ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا — سر پہ شیطان کے پاں اور بھی شیطان چڑھا
اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی — پانی سو زیرہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

نام میرا سن کے مجنوں کو جماہی آ گئی — بید مجنوں دیکھ کر انگڑائیاں لینے لگا
مجھ کو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جب روز حشر — مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسماں لینے لگا
لے کے آئینہ جو دیکھی حسن کی اپنے بہار — اپنے بو سے آپ وہ غنچہ دہاں لینے لگا
موت اس کی یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور — یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

کھچ گیا میری طرف سے اور بھی دلبر کا دل — واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا
ہے بُرا تو ہی اگر آیا نظر تجھ کو بُرا — تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا — اگر چہلم کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا
نوشتے سے ہوا اک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم — جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا
لگائی زلف کو شانے نے جو انگلی پکارا دل — یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں — ازل نام اِس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا
ملے اکسیر گر اس کشت و خوں سے بیچ لوں ہرگز — مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا
سرِ راہِ فنا میں ہوں مہیا ہے سفر لیکن — بہ رنگ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

نہیں گوش شنوا باغِ جہاں میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے — ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا
جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا
القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا
ذوق بیمارِ محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جاں بر نہ ہوا

بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا
جاہلِ منکر نہ آئے راہ پر معجز سے بھی
جہل سے بوجہل اپنے نامسلماں ہی رہا
کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا توتے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
حلقۂ گیسو میں دیکھی کس کے رخسارے کی تاب
شب مہ ہالہ نشیں سر در گریباں ہی رہا
مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینے میں رہے
آخرش دل بہ گیا خوں ہو کے، پیکاں ہی رہا
سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں آنکھوں سے پنہاں ہی رہا
مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہی ذوق کیا اس وقت بھی اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

نہ جھاڑا غیر کو تونے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تونے بدزباں باندھا

جہاں میں عرصہ عشرت سے سوا دہ چند ہی غم کا کہ ہی گر عید کا اک دن تو عشرہ ہی محرم کا
شہید ای ذوق سینے میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں مری جو آہ ہی گویا وہ ہی اک نخل ماتم کا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

وہ کون ہی جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا
کیا قہر ہی وقفہ ہی ابھی آنے میں ان کے اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا
دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہی دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا
ای ذوق تکلف میں ہی تکلیف سراسر آرام سے وہ ہی جو تکلف نہیں کرتا

نظم معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف باندھیں گر اہل سخن حال پریشاں اپنا

ای جنوں اہم پا برہنہ، اگر م پتھر زیر پا دو پہر ہی، سایہ بھی بیٹھا ہی چھپ کر زیر پا
زیر دستی پر بھی، ہی موذی سے لازم احتراز جب دبے گا سانپ کاٹے گا مقرر زیر پا

دشمن جاں یک بیک سارا زمانہ ہو گیا ہائے تاثیر محبت، یہ ستم کیا ہو گیا
تم میں تھا یا مجھ میں تھا دل، پھر کہو کیا ہو گیا دل کے جانے کا تو عالم کو اچنبھا ہو گیا

جس کو ای ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر دُبلا ہوا ایسا کہ کانٹا ہو گیا
خط لکھا مجھ کو تو اس میں نام بھی پورا نہ تھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

نہ تھا نیں اس باغ میں نخلِ گُلِ آتش بازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

برنگِ گُل صبا سے کب کھلا دل گیر دل میرا
کہ ہر باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا
بتوں کی سرد مہری نے کھلا دی زعفراں لیکن
کرے کیا گرم جوشی ہو گیا کشمیر دل میرا

تم نے دشمن ہی جو اپنا ہمیں جانا اچھا
یار ناداں سے تو ہی، دشمن دانا اچھا
بیٹھ رہ کر کے قناعت، کہ بہ شکلِ مہِ نو
چھوڑی آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

ذوقؔ ہی ترکِ وطن میں صاف نقصِ آبرو
پکتے پھرتے ہیں گُہر ہو کر سمندر سے جدا

سخت دل اور اشک ترا دونوں بہم، دونوں جدا
ہیں رواں دو ہم سفر، دونوں بہم، دونوں جدا
میں نہ چکوا ہوں، نہ وہ چکوی، پھر آخر کس لیے
رہتے ہیں شب تا سحر، دونوں بہم۔ دونوں جدا

لے گا دل اس عشق سے کیا تو، جس نے ہی کوہ و صحرا میں
مجنوں کا وہ حال کیا، فرہاد کا ہی وہ حال کیا
آگ ہی دل میں، درد جگر میں، آنکھ میں آنسو، لب پہ فغاں
عشق نے اس کے ذوقؔ ہمارا دیکھ لو کیا یہ حال کیا

J & K University Library

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا ۔۔۔ مَیں نے کیا ایسا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

اُچھلے ہی شیخ وجد میں اس طرح بار بار ۔۔۔ جس طرح بدلگام ہو گھوڑا چراغ پا

عاجزی سے رہے آئے نہ ہوا میں کم زور ۔۔۔ موت ہی چیونٹی کی ہو دیں اگر پر پیدا

دُر فشاں وقت سخن ہیں لب رنگیں تیرے ۔۔۔ ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا

اشک گرم ایک بھی دریا میں جو ٹپکے میرا ۔۔۔ جائے ماہی ہو تہ آب سمندر پیدا

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے ۔۔۔ دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھیرے گا

ولیکن تو بھی گر چاہے کہ بیٹھ ٹھیر دوں نہ ٹھیرے گا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی

اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیرے گا

سُرمہ ہے سفاک تہرہ ہی نگاہ یار کا ۔۔۔ سچ کہا ہے باڑ کاٹے نام ہو تلوار کا

کوچۂ زلف بتاں میں دل پڑا ہوگا کہیں ۔۔۔ پوچھتے کیا ہو ٹھکانا اس خدائی خوار کا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر ۔۔۔ کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار ۔۔۔ آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا ۔۔۔ دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا
وہ ل گیا تو جانیے کچھ بھی نہیں گیا
خورشید وار چرخ پر چمکا کوئی تو کیا
آخر کو پھر جو دیکھا تو زیرِ زمیں گیا

یوں لائے واں سے ہم دلِ سیپارہ کر کے جمع
دیکھا پڑا جہاں کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا
جو بار آسمان و زمیں سے نہ اٹھ سکا
تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھا لیا

آنا تو خفا آنا ، جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا ، جانا ہے تو کیا جانا
کیا طبع میں جودت ہے جھٹ دل کی اُڑا جانا
ہونٹوں کا یہاں ہلنا، واں بات کا پا جانا

کیوں کہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہ جو تجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا
مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا

دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جھٹکا ٹوٹ گیا
طائرِ جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

دل کہاں جس پر گماں ہو غنچۂ تصویر کا
ہے کوئی سینے میں خوں آلودہ پیکاں تیر کا

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا، کودنا
ہائے طفلی! کھیلنا، کھانا، اچھلنا، کودنا

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی ، گھر میں خدا کے مارا

ہوے انسان ہم دردِ محبّت کے لیے پیدا　　فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لیے پیدا

کچھ رازِ نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا　　گونگے کا سا ہی خواب، بیاں ہو نہیں سکتا

ت

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبّت　　لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

خاکسترِ پروانہ دکھا دوں میں اُڑا کر　　پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبّت

کہتی تھی وفا نوحہ کُناں نعش پہ میری　　سونپا کسے تو نے مجھے ناکامِ محبّت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہی ذوق　　اولاد سے تو ہی یہی دو پشت چار پشت

ج

راحت و رنج زمانے میں ہیں دونوں لیکن　　یاں اگر ایک کو راحت ہی تو دو چار کو رنج

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج　　کہہ ای طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ح

ٹھیری ہو ان کے آنے کی اب کل پہ جا صلاح　　ای جاں برلب آمدہ تیری ہی کیا صلاح

کر

جو رنگِ الفت سے آشنا ہیں، وہ گر برے بھی ہیں خوش نما ہیں
کہ رنگ ہی سے گراں بہا ہیں، عقیق و یاقوت سنگ ہو کر
صفائے دل کی یہی ہے صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائیں گے بالضرورت، اس آئینے میں یہ زنگ ہو کر

کہا پتنگ نے یہ دارِ شمع پر چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مرلے کسی کے سر چڑھ کر
دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اُتر چڑھ کر
ہنر شناس کو دکھلا ہنر کہ خوبیٔ زر
اگر کھلے ہے تو صرّاف کی نظر چڑھ کر
جو مارے نفس کو اور کرے اپنے غصّے کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

واں سے یاں آئے تھے اے ذوقؔ تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائیں گے ہم، لاکھ تمنا لے کر

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
سرد مہری سے کسی کی آگئے ہی دل سر نہ ہو
یاں سے ہٹ جا دھوپ اے ابر بہاراں چھوڑ کر
گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری گو کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گم نام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیٔ قدرت جگہ واں چھوڑ کر
اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر
گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

گرچاہتا ہے مثلِ مہِ چاردہ فروغ آ پھر کے شہر شہر میں کسب کمال کر

لگا کے باتوں میں ان کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہہ دیں ٹھکانا جس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر

س

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

ع

ذوق کیوں کر ہو اپنا دیوان جمع کہ نہیں خاطر پریشان جمع

ق

پھر کر اِدھر اُدھر کبھی نہ اپنا گیا قلق لفظ قلق کی طرح سے یوں ہی رہا قلق

ک

مرا دل ایک، دوں اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں
کہ ہیں واں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں سو بھی ہیں جدا ایک سے ایک

ل

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمنِ جاں ہو مری کنار میں دل

م

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھل من مزید بھول
لائیں جو آہ کو شررافشانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہو یا قدیم
کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوے شرمندہ یار سے
اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

ن

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں

ہوتی ہے جمع زر سے پریشانی آخرش
درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

ساقی ملے ہزار فلاطوں ہیں خاک میں
جو خُم بنے ہر قالبِ آدم سے کم نہیں

اس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں تامل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں / ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر / دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اس عالمِ تصویر میں سب / اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی مے خوار کا دل / محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

تابِ دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر / کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی دہاں خوب مگر / تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوقؔ چمن سے گزرا / آج جو سرد نسیمِ چمنی خوب نہیں

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں / اپنا ہی یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

مردار ہیں وہ طائرِ سدرہ ہی کیوں نہ ہوں / تیرِ نگاہِ یار کی جو دور زد سے ہیں

خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ / روشن ضمیر ملتے ہر ایک نیک و بد سے ہیں

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تیمناً / بنیادِ میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں

جاں دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ / اس میں جنابِ خضر ابھی نابلد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یار / بہتر سمجھتے ہم اسے عمرِ ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یاں روشِ نشۂ شراب / ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہرِ داغِ عشق / ہم کرتے ذوقؔ عشق کا دعوا سند سے ہیں

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں / پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے ہم بس میں

جو ہو گوشہ نشیں تیرے خیالِ بیتِ ابرو میں / وہی بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار ان کے / ہزاروں دے چکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضموں ذوقؔ ایوانِ دو عالم میں ہیں موزوں / حواسِ خمسہ ہیں انساں کے وہ بندِ مخمس میں

ترے خرام کے پیرو ہیں جتنے فتنے ہیں — قدم سب آن کے وقتِ خرام لیتے ہیں
ترے قتیل بتاتے نہیں تجھے قاتل — جب ان سے پوچھا اجل ہی کا نام لیتے ہیں

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانے میں — شمع ہو اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانے میں
میں ہوں وہ وحشت کہن مدت سے اس ویرانے میں — برسوں مسجد میں رہا برسوں رہابت خانے میں
برقِ خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں

علم جس کا عشق اور جس کا عمل وحشت نہیں — وہ فلاطوں ہو تو اپنے قابلِ صحبت نہیں
خواہ گردش ہو زمیں کو خواہ پھرتا ہو فلک — پر ہمیں زیرِ فلک سر منزلِ راحت نہیں
دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال — چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں
کہتے ہیں مر جائیں گے چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے — پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں
ایک دل اور اس پہ اتنے بارِ غم، اللہ رے دل — اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں
ذوقؔ اس صورت کدے میں ہیں ہزاروں صورتیں — کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

وقت پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو — دل خانہ خراب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری — ہیں یہ چشم پُر آب کی باتیں
تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل — تیری یہ اضطراب کی باتیں
جامِ مے لب سے تو لگا اپنے — چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم — کس مزے سے عتاب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ — ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں پر کیونکہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کے اٹھائے میری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

گزرتی عمر ہے یوں دورِ آسمانی میں کہ جیسے جائے کوئی کشتئ دخانی میں
رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
لگاتے تہمتِ گریہ ہیں دل جلوں کو ترے یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں
کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا بقا کا ذکر ہے کیا اس جہانِ فانی میں

تو کہے غنچہ کہ اس لب پہ ہنسی خوب نہیں چپ! کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں
سامنے سے مرے ٹلتا نہیں ناصح جب تک مغز کھاتا مرا دو چار گھڑی خوب نہیں
منہ چڑھے تیغِ غمِ عشق کی، کیا منہ ہے ترا بوالہوس تجھ پہ کوئی ضرب بڑی خوب نہیں
خوب رویوں سے بہت آنکھ لڑی پر افسوس قسمت اے ذوق کہیں اپنی لڑی خوب نہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں
ہے ان کی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم جدھر ہے ان کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھو شغلِ اسیری میں ہم غریبوں کا کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں
یہ کس کو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھا کر پڑا زمیں پہ جو نورِ قمر کو دیکھتے ہیں
وہ خاک اڑائیں گے بازارِ عشق میں آ کر جو پہلے آن کے سود و ضرر کو دیکھتے ہیں
بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
نگیں کو دیکھ لیں چاہیں جو نام عالم میں کہ سبب کاوی میں یاں نام ور کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینے سے دل کا آئینہ ہی جدا
اس آئینے میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

عیار نقدِ محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوقؔ کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہو! پائے نگاہ
اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں

پھرتا ہی سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہی وقتِ رفتن آب میں

صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہی آہن آب میں

وعدہ ہی آنے کا اس کے ابر کھل جائے تو آئے
ڈالتا ہوں دمبدم اٹھ اٹھ کے روغن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہو گیا ای شوخ پُرفن آب میں

بھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بہے ای طفلِ کودن آب میں

غم نامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہی شورِ الغیاث صریرِ قلم نہیں

وہ دن ہی کون سا کہ ستم پر ستم نہیں
گر یہ ستم ہیں روز تو اک روز ہم نہیں

مضموں کے پیچ و تاب سے تابِ رقم نہیں
ہی زلفِ یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں

گو اضطرابِ دل کو عیاں کرتے ہم نہیں
پر جو نگاہ ہی رگِ بسمل سے کم نہیں

مشکل ہی میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اہلِ وفا یہ تمہری خدا کی قسم نہیں

اہلِ صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر
گوہر ہی اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دلِ گم شدہ کا کھوج
ہی چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

سر بازِ عشق کے لیے دار الاماں کہاں
محفوظ قطع سے سرِ شمعِ حرم نہیں

جاتا ہی آنکھ بند کیے ذوقؔ تو کہاں
یہ راہ کوئے یار ہی راہِ عدم نہیں

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں، نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

کیسا مومن کیسا کافر، کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے، سارے شر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دل میں رہوں میں، جلوۂ جاناں کہتا ہے میں!
کس کو نکالوں کس کو رکھوں، یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

ذوقؔ مرتب کیوں کہ ہو دیواں، شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفرؔ کے جھگڑے ہیں

وصفِ چشم و وصفِ لب اس یار کا کہنے کو ہیں
آج ہم درسِ اشارات و صفا کہنے کو ہیں

وہ جنازے پر مرے کس وقت آئے دیکھنا
جب کہ اذنِ عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

مٹ گئے جوہر وفا کے اُٹھ گئے سب اہلِ دل
اب وفا ہے نام کو اور باوفا کہنے کو ہیں

سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا ٹل گیا سارا
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

عدوئے نیش زن ہر دم ہے میرے درپئے ایذا
یہ موذی زہر کی ہے گانٹھ بچھو اس کو کہتے ہیں

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

ہوں طائرِ خیال، نہ پر ہیں نہ میرے بال
پر اُڑ کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں

سرگشتگی بخت نہ دے مجھ کو اتنے پیچ
کچھ چینِ زلف، کچھ شکنِ آستیں ہوں میں

یا رب کنوئیں کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں
نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

دل میرا محو ضبط ہی اور مجھ کو اضطراب — دل میرا مجھ سے تنگ ہی میں دل سے تنگ ہوں
ہیں سب سے پہلے میرے اٹھانے کی فکر میں — محفل میں ان کی میں کسی چوسر کا رنگ ہوں

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں
نفس اک تار ہی سینے میں سمجھو یا گریباں میں
تمھارے تیر ہیں شاداب کرتے دل کے زخموں کو
ہمیشہ آب پیکاں سے ہی شبنم اس گلستاں میں

مرے نالے کہیں اس گنبد بے در سے اوپر ہیں — ہوا کیوں باندھتے بادل یونہی ورے سے اوپر ہیں

صاحب دلوں نے کعبۂ دل پر کیا مقام — کب کرتے قصد دیر و حرم ایسے شخص ہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں — کیا جانے لکھ دیا انھیں کیا اضطراب میں

اب کے دل لے لوں تو پھر اس بت قاتل کو نہ دوں
جاں دوں، مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں
چار ٹکڑے کروں دل کے کہ نہیں ہو سکتا
لب کو دوں رخ کو نہ دوں زلف کو دوں تل کو نہ دوں

نہ ڈال آبلے اے گرمیٔ فغاں منہ میں — کہ چپکا بیٹھ رہوں بھر کے گھنگھنیاں منہ میں

ہمارا پی کے لہو تیرے تیر کا سوفار یہ چپ ہوا ہے کہ گویا نہیں زباں منہ میں

اسیرِ رنج و غم میں ہوں مریض جاں بلب میں ہوں
اور اس پر اب تلک جیتا ہوں میں کوئی عجیب میں ہوں
جو مانگوں موت دردِ ہجر سے مجھ کو نہیں زیبا
کہ نام عشق لوں اور اس قدر راحت طلب میں ہوں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں ہنستے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغ خوش الحاں زمانے میں
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقّار خانے میں

ہوا ہے اور نہ ہووے گا کوئی پیدا خدائی میں وفا میں کوئی مجھ سا اور تم سا بے وفائی میں

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں بہانا کر کے منت کا پنہایا طوق گردن میں

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اٹھے ہیں آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں ہو نے برسوں، نہ ہوئی پردہ تمہاری پرسوں

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں کہ تھا بلبل کی گردن کا بڑا قمری کی گردن میں

و

دانہ خرمن ہی ہمیں، قطرہ ہی دریا ہم کو — آئے ہی جزمیں نظر گل کا تماشا ہم کو
اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو — کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہم کو
اور ہمدرد کہاں، ہو نہ ہوا حضرتِ دل — درد اب تم کو ہمارا ہو تمھارا ہم کو
اثرِ کفر ہی طاعت سے بھی اپنی پیدا — نقش سجدے کا ہی پیشانی کا ٹیکا ہم کو
آن پہنچی سرِ گرداب فنا کشتیٔ عمر — ہر نفس بادِ مخالف کا ہی جھونکا ہم کو
ہر قدم پانوٓمیں سر رکھتے ہیں خارِ سرِ دشت — اے جنوں تونے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو
کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت — پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو
ایک دم عمرِ طبیعی ہی یہاں مثلِ حباب — فکرِ امروز ہی نی ہی غمِ فردا ہم کو

دیکھو آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے — ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں — سر پہ پھرتا ہی لیے آبلۂ پا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں — دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو
عمرِ رواں کا توسنِ چالاک اس لیے — تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو
یہ تنگنائے دہر نہیں منزلِ فراغ — غافل نہ پانو حرص کے پھیلا بکھیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو — غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو
ہو تو ہو آباد کیوں کر یہ خراب آباد دل — عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شورِ قیامت جس کو وہ ای چشمِ یار
تیرے مستوں کی صفیرِ خوابِ غفلت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہی پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

دستِ ہمت سے ہی بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پستِ قامت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ در رسمِ کتابت ہو تو ہو

رات ایک بگڑی ہوئی تھی دخترِ رز میں آن مے
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

تمنا نہیں ہی کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدِ قلق ہو
یہی حق ہی قاتل اگر حق دلا دے، یہ بسمل ترے پانو پر جاں بحق ہو

جو مے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو تو سرخی نہ کیوں اس کے رخسار پر ہو
غروب آفتابِ درخشاں اگر ہو، تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو

کتابِ محبت میں ای حضرتِ دل، بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی، لیے دستِ افسوس کے دو ورق ہو

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہو، گر اس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگرِ آتش ہو

لبیک واذاں، ناقوس و جرس، یا قلقلِ مے، یا نالۂ نے
دل کھینچے کو ای ہم نفسو! کوئی تو نوائے دلکش ہو

شام ہی سے دلِ بےتاب کا ہی ذوق یہ حال
ہی ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

حرم کو جائے زاہد ہم تو مے خانے کو چلتے ہیں
مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو — یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات — جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو — وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

جو ہیں مرتے حسنِ صفات پر، وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوقؔ اسی ذات میں کہ جو ذاتِ جملہ صفات ہو

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو — کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو
قصدِ کعبے کا تھا پھرے الٹے — چوم کر اس کے آستانے کو
تو مکدر نہ ہو تو عشق میں ہم — ایک آندھی ہیں خاک اڑانے کو

تصور کس طرح بھولے ترا اس چشمِ گریاں کو — نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو
نکالوں کس طرح سینے سے اپنے تیرِ جاناں کو — نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو — عید ہوئی ذوقؔ، وے شام کو

تم بھی مل کر نہ غرفے سے نکالا منہ کرو — اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو

اشک بلاہی مری مژگاں کی زرا دیکھیں تو — کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بہت بے باک ہو
یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

حق نے تجھ کو ایک زباں دی اور دیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو

۵

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا ان پہ بھرم اور زیادہ

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب ان سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

ہے باغ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر انھیں کم اور زیادہ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُرمحن کے ساتھ
اک زخم تازہ روز ہے زخمِ کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہتِ گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دامِ علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پانو سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

نو جان ہی ہماری اور جان ہی تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے، ایمان ہی تو سب کچھ

لے نگاہ مہر سے دل مت بہ چشم قہر دیکھ
گر دیے سے جو مرے تو دے نہ اس کو زہر دیکھ

زیادہ ہوگا توکل سے بھی کہیں روزہ
کہ اس میں آیا تو روزی ہی اور نہیں روزہ

"ی"

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہی اس آزار سے

اپنے دامن کو بچا کر جا بہو
برق ہمیرے وادیٔ پرخار سے

اس دہن کا نکتۂ موزوں بھی ایک
منتخب ہی مخزنِ اسرار سے

خاک عاشق پر اٹھے جائے غبار
فتنۂ محشر تری رفتار سے

ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں
الجھے کب دامن صبا کا خار سے

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہی خبر آتی نفس کے تار سے

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

غلط فہمی ہماری تھی جو ان کو آشنا سمجھے
ہم ان کو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے
بہا خوں کو دے قاتل ہیں اسی کو خوں بہا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

ای سنگ دل آرامِ جانِ مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

جو کچھ دل پر گزرتی ہو سنائیں گے ہم اس بت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کو سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حساب دوستاں در دل اگر وہ دل رُبا سمجھے

اگر دل کو نکالا چیر کر بیکاں تو رہنے دو
کہ عاشق اپنے پہلو میں اسی کو دل کی جا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہو
تمھیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

عدو آیا ہو بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا
کریں گے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے

مجھے آتا ہو رشک اس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو ورع ماکدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے

نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغ معصیت کو نقش پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہو کوئی بات ذوق اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا
تسلی آکے مجھے وقتِ اضطراب تو دے

زبانِ خنجرِ قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دلِ شہید تو چپ کیوں ہو کچھ جواب تو دے

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہو
حوروں پہ مر رہا ہو یہ شہوت پرست ہو

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہو صورت پرست ہو

درویش ہو وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہو

دولت کی رکھ نہ مار سرِ گنج سے امید
موذی وہ ڈسے گا کیا کہ جو دولت پرست ہو

عنقا نشاں چھپا کے ہو بیٹھا برائے نام
گم گشتہ کون کہتا ہو شہرت پرست ہو

یہ ذوق مے پرست ہو یا ہو صنم پرست
کچھ ہو بلا سے، لیک محبت پرست ہو

روزِ محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہییں
گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہو

گاہ ہجومِ یاس میں ہو دل، گاہ ہجومِ حسرت میں
ہو یہ مردِ سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر میں

میری خاکستر اُڑی تھی اس سے گردوں سب بنے
اس میں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے

غنچۂ تصویر بھی کھل کر جو عقدے وا نہ ہوں
ہائے قسمت وہ ہمارے عقدۂ مطلب بنے

ہے سیہ کاری سے نامہ یاں تلک اپنا سیاہ
روزِ محشر پر پڑے گر سایہ اس کا شب بنے

صحبتِ علیٰ بنائے کیا گدھے کو آدمی
جس کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

دیوانہ آکے اور بھی دل کو بنا چلے
اک دم تو ٹھیرو اور کہ کیا آئے کیا چلے

بل بے غرورِ حسن زمیں پر نہ رکھے پاؤں
مانندِ آفتاب وہ بے نقشِ پا چلے

کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

افسوس ہے کہ سایۂ مرغِ ہوا کی طرح
ہم جس کے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے

ہو کر سوار توسنِ عمرِ رواں پہ آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

بے جائیں تیرے کشتے کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
خاک کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے

بیت ساقی نامے کی لکھو کوئی جائے دعا
مے پرستوں کے کفن پر کلکِ چوبِ تاک سے

عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسن عارضی | زیب بد اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

وہی زیبا ہی اس کے واسطے جو قطع ہو اس پر | نکل سکتا ہو کوئی آستیں کا کار دامن سے
فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جا نماز اپنی | اگر دھو ڈالے تو داغِ منیٔ پندار دامن سے

زندہ تو ڈوبے ہو اور تیرے ہی مردہ آب میں | بوجھ شاید جسم کا کم ہی نفس کے بوجھ سے
نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بارِ حرص | یہ گدھا تو رہ گیا دلدل میں پھنس کر بوجھ سے

رخصت اے زنداں، جنوں زنجیر در کھڑکائے ہی | مژدہ خار دشت، پھر تلوا مرا کھجلائے ہی
واہ واشور محبت خوب ہی چھڑکا نمک | استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہی
نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہی انتظار | جانبِ در دیکھ لے ہی جب کہ ہوش آجائے ہی

گر آپ کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے | تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے
وہ خُلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں | ہیں شاخ ثمر دار میں گل پہلے ثمر سے
کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہی ہمیشہ | کیا جانے کہ آجاتا ہی تو اس میں کدھر سے
اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا | بہتر ہی ملاقات مسیحا و خضر سے

یاں وعدہ بھی آپہنچا تو اب تلک آتا ہی | اللہ رے تری غفلت کیا دیر لگائی ہی

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے | تونے مارا عنایتوں سے مجھے
کیا کہوں کہ رہے ہیں کیا کیا کچھ | غیر تیری حمایتوں سے مجھے

واجب القتل اس نے ٹھیرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے
حال جہرو وفا کہوں تو کہیں
نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیاگر ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

آنکھ اس پُر جفا سے لڑتی ہے
جان کشتی قضا سے لڑتی ہے
نگہ ناز اس کی عاشق سے
چھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے
آج کہتے ہو کیا طبیعت کو
عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں یہ بڑا بدمعاش ہے
اس بت کدے میں کون ہے کافر ترے سوا
تو آپ بت پرست و بت و بت تراش ہے
کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق
شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

ہی تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی — رکھے گی بہ نہ بال برابر لگی ہوئی
بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خُمِ مے کی طرح ہم — پر کیا کریں کہ مُہر ہی منھ پر لگی ہوئی
یہ چاہتا ہی شوق کہ قاصد بجائے مُہر — آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی
ای ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منھ لگا — چھٹتی نہیں ہی منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

بے محبت نہیں ای ذوق شکایت کے مزے — بے شکایت نہیں ای ذوق محبت کے مزے

گل ہائے رنگ رنگ سے ہی رونقِ چمن — ای ذوق اس جہاں کو ہی زیب اختلاف سے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے — ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں — کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے — جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے
ہائے رے حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی — تکتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے
نہ ستم کی ہی شکایت نہ کرم کی خواہش — دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہی ان کے عمل سے — کیا حضرتِ آدم کی بھی اولاد غضب ہی
غصہ ہی ترا قہر، ترا قہر قیامت — رنجش تری بیداد ہی، بیداد غضب ہی
وہ کون سا غم ہی کہ جو دنیا میں نہیں ہی — اور اس پہ بھی دل کش یہ غم آباد غضب ہی
سو فتنے ہیں پنہاں نظرِ لطف میں اس کی — یہ لطف نہیں ای دلِ ناشاد غضب ہی

ہمیں غرض کیا کہ جائیں گے ہم، حرم کو ای شیخ بت کدے سے
یہیں بتوں میں خدا کا اپنے ظہورِ قدرت نہ دیکھ لیں گے

اگرچہ دردِ محبت اپنا کہا نہ میں نے زباں سے اپنی
وہ میری صورت نہ دیکھ لیں گے، وہ میری حالت نہ دیکھ لیں گے
خط ان کو دے بھی دیا جو قاصد نے ذوقؔ دے کر کسی کا دھوکا
وہ خط نہ پہچان لیں گے میرا، مری عبارت نہ دیکھ لیں گے

کیا مدنظر تم کو ہو یاروں سے تو کہیے
گر منھ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے
کہیے نہ تنک ظرف سے اے ذوقؔ کبھی راز
کہ گر اسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہیے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہو
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہو
زالِ دنیا ہو عجب طرح کی علامۂ دہر
مردِ دیں دار کو بھی دہر یہ کر دیتی ہو
شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانے سے
جان دیتا ہو اگر وہ تو یہ سر دیتی ہو

مزے موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض بھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیوں کہ بے وضو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
یقیں ہو صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے
عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے
سراغ عمرِ گزشتہ کا لیجیے گر ذوقؔ
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

اس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہو
وہ اپنی جا نماز ہو اور یہ نماز ہو
ناساز ہم سے جو ہو اسی سے یہ ساز ہو
کیا خوب دل ہو واہ ہمیں جس پہ ناز ہو

دروازہ مے کدے کا نہ کر بند محتسب ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینہ بھر کے
آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم تو ڈبو دو انھیں دریا میں سفینہ بھر کے
دل ہے آئینہ صفا چاہیے رکھنا اس کا زنگ سے بھرتا ہے کیوں اس میں تو کینہ بھر کے

جو تھے مژگانِ پُرخوں سب وہ خارِ دل نشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر تھے کہیں ڈوبے کہیں نکلے
ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے
خدا دے دور بینی اور اس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دور بیں نکلے
جو حسرت میرے دل میں ہے نکالوں میں کہاں اس کو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے
سُنا کرتے تھے شہرہ ذوق جن کی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

غنچے ترے غنچہ دہنی کو نہیں پاتے ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے
وہ کون سی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے
میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی گم ہو کے مری گم شدگی کو نہیں پاتے
وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

سمجھے ہو راکبِ کشتی کہ ہے ساحل چلتا | پر حقیقت میں ہے کشتی سرِ جیحوں چلتی
ذوقِ گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے | کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل | اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لیے | ستم شریک ہوا کون آسماں کے لیے
سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لیے | ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کے لیے
نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں | عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے
الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا | کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لیے
مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کے لیے | پہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے | رہا ہے سینے میں کیا چشمِ خوں فشاں کے لیے
نہ لوحِ گور پہ مستوں کی ہو نہ ہو تعویذ | جو ہو تو خشتِ خمِ مے کوئی نشاں کے لیے
وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن | لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو | زباں نہ دل کے لیے ہے نہ دل زباں کے لیے
اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل | ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لیے

بنایا ذوقؔ جوانساں کو اس نے جز و ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے | وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے
اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا | جانے دو تم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے
حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی | ہیں تیغِ آبدار سے خوں میں نہا چکے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے
دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشاں
دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے
مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو مے کدے کو ذوق
اٹھو کہیں، وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ابر تر، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع درد کا
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
سن کے آمدان کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کیا ہوا ای ذوق ہیں جوں مردمک ہم رو سیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو کچھ کہ ہی دنیا میں وہ انساں کے لیے ہی
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہی
کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہی تو میری شبِ ہجراں کے لیے ہی

چھنی تو نے افشاں جو ای مہ جبیں ہی
ستاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہی
نہ پوچھو کہ دل شاد ہی یا حزیں ہی
خبر بھی نہیں یاں کہ ہی یا نہیں ہی
یہی گر تری چشمِ سحر آفریں ہی
تو دل ہی، نہ جاں ہی، نہ ایماں، نہ دیں ہی
پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیرے
کہ ہیٹ ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہی

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ لسنے نہیں جنھیں ترشی اُتار دے
ای شمع تیری عمرِ طبیعی ہی ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
بے فیض چشمہ آبِ مصفا کا ہی تو کیا
مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کا آئے تو پہلے پکار دے

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہی
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

ترا تیرِ نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہی بن کر موت کا پیغام چلتا ہی

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دنیا میں
یہ تیرا غضب جادو ای خیالِ خام چلتا ہی

دم کو نہیں ہی سینے میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہی کہ مسافر وطن میں ہی

ہوش و خرد کو دیکھ لیا دردِ سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ گئے دیوانہ پن میں ہی

یہ آرزو ہی جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم سے تر جائیں گے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوا تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

کہتے ہیں جھوٹ سب کہ نہیں پانو چھوٹ کے
چھوٹے تو بیٹھے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

کیوں کر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

بے تابئ دل کا کوئی مضموں جو ہوا نظم ہر حرف پہ میرے حرکت جائے سکوں ہی

زباں کھولیں گے مجھ پر بدزباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے
گذرتی ہو مزے میں زندگی غفلت شعاری سے
مرے نزدیک بے ہوشی ہی بہتر ہوشیاری سے

دل کہاں سیرِ تماشے پہ مرا لگتا ہی دل کے لگ جانے سے جینا بھی بُرا لگتا ہی

اثر ہو نالۂ پُردرد کا اتنا تو اى بلبل کہ ٹپکے جائے شبنم، اشکِ انجم چشمِ گردوں سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی
کسی کے دل کا سنو حال دل لگا کر تم جو ہووے دل کو تمہارے بھی مہربان لگی
خدا کرے کہے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی کہ زلف اى بت بدکیش تیرے کان لگی
تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیِ عمر سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارے آن لگی
خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے کہ اس کے ساتھ ہی اى ذوق میری جان لگی

وہ ہوں میں پُرمعاصی سوختۂ سوزِ ندامت سے
حذر دوزخ کرے جس کے شرارِ سنگِ تربت سے
اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں دن رات نالاں ہی
تو میں کہہ دوں محبت سے، محبت سے، محبت سے

حریصوں کو نہیں جا وسعت آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پانو پھیلائے فراغت سے

کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بے تاب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا تھا القاب مجھے

سفرِ عمر ہی یارب کہ ہی طوفانِ بلا
ہر قدم سیلِ حوادث کا ہی گرداب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا
دل بے تاب کو میں اور دلِ بے تاب مجھے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہی یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بہ وقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہی ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

ستم گر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے

حرفِ زبانی ہو کہ خط، قول ان کا سچ ہو یا غلط
میری تو اب تسکیں فقط، ای دل تری تسکیں پہ ہی

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے
تمھارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا وگرنہ اشک جلتے تھم ابھی سے

حالتِ نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی ہر ناز سے ٹپکتی ہو مستی شراب کی
کوچے میں آ پڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم یاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
نکلے ہو مے کدے سے ابھی منہ چھپا کے تم نالے ہوے بغل میں صراحی شراب کی
اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے معلوم ہے حقیقتِ ہو حق جناب کی

سینکڑوں کاسۂ سر دہر میں مانندِ حباب کبھو اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے

آتے ہی تو نے گھر کو پھر جانے کی سنائی ہو جاؤں سن نہ کیوں کر یہ تو بری سنائی
مجنون و کوہ کن کے سنتے تھے یار قصے جب تک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جل جائے خاک وحشیِ چشم بتاں پہ گھاس لیکن ہرن گھری نہ رہے بن ہری ہوئے

آنا ہے گرچہ اُن کا قیامت پہ منحصر ہم خوش ہیں یہ کہ آنے کی ان کی خبر تو ہے
وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہووے ذوق بہتر ہے اس سے سنگ کہ اس میں شرر تو ہے

جمالِ یار نے مڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

گر حقیقت بیں ہے رہنا تو نہ رکھ خود بینی بھولے بندہ جو خودی کو تو خدا یاد رہے
ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے — قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تھم پرے

یارب کدھر کو جائے یہ جاں بازِ درد و غم — باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے

کیا تمھیں اے اولوالابصار نظر آتا ہے — یاں تو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے

معنیٔ رنگِ خموشی سے جو دل ہو آگاہ — برگِ گل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے

عالمِ دل میں کبھی آکے فلک کو دیکھو — کیا پسِ پردۂ زنگار نظر آتا ہے

جو جواں مرد علائق میں پھنسا ہے وہ مجھے — شیر پنجرے میں گرفتار نظر آتا ہے

صحبتِ اہلِ صفا دیتی ہے سرکش کو اُلٹ — نخل پانی میں نگوں سار نظر آتا ہے

دکھلاتا اک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ — اس سادہ پن کے ساتھ ترا بانکپن مجھے

خلل بنائے مکاں کو پہنچے تو ہوگا نقصاں مکیں کو پہلے
مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

غلط ہے، تہمت ہے، افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے
کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمھارا گھر ہے

چلتے اس طرح سے اس کوچے میں ہیں دل اور ہم
دل سے ہم آگے کبھی ہم سے کبھی دل آگے

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے — جو کور ہو عینک سے اسے کیا نظر آئے

کیا وہ دُنیا جس میں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے؟

خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے
اے سکندر کس لیے؟ دو گزِ زمیں کے واسطے؟

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے صبا وہ دھوْل لگائے کہ بس سحر ہو جائے

ہم ہیں غلام ان کے جو ہیں وفا کے بندے اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے
مت بھول بندگی پر غرّہ میں آ کے بندے زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

پیش آ اکرام سے ساری کرامت ہے یہی عادتِ بد ترک کر تو خرقِ عادت ہے یہی

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

درد دل سے لوٹتا ہوں میں اکس کو درد ہے میں ہوں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

الفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تو جائے یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

بد نہ بولو زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے
ہی یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

جہاں دنیا میں دیکھا سچ کے اوپر جھوٹ فائق ہی
کہ پہلے صبح کاذب ہی تو پیچھے صبح صادق ہی

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

گل بھلا کچھ تو بہاریں ای صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہی جو بن کھلے مرجھا گئے

قطعے

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوئی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب، اگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مری سینہ زنی کا شور سُن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھا یا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ
بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوعِ صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو
پڑھی یاسیں سرہانے بے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی
اذاں کے ساتھ یُمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا ای ذوق
ہے بُرا وہ ہی جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں بُرا کہنے سے تو اس کے بُرا مانتا ہے

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہوا پیوست
گزرتی ہو گی بہ آرام زندگی تیری
کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات میں انساں
کبھی نہ ہو گا دل آسودہ گو ہو مست الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ با فراغ کرے کنجِ عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
تو سلسلے میں فقیری کے وہ ہوا پابست

رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست
جو دست گاہ تصرف میں بھی ہوئی اس کو
تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالادست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمنِ سرکش ہے اس کو دیجے شکست
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست
کہ گر د قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدۂ زہمہ با خدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوۂ گل ہائے رنگا رنگ ہم
مثلِ نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خدا کے ہاتھ سے
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگ بہار
پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور سبزہ یہ ہوا
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت
این تماشائے جہاں را مغتنم بینیم ما

رباعیاں

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے
سب کہتے تھے ان کو آپ کو ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوقؔ
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

اے ذوقؔ کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اک دم نہ ترا صرفِ مناجات ہوا
جب تک تھا جوان، تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا، پیرِ خراباتِ ہوا

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھِل کھِل
اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہِل ہِل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے
اے ذوقؔ بڑھاپے سے ہے دنیا کِل کِل

ان آنکھوں سے روئے لالہ گوں بھی دیکھا
اور پھر ان کو بر اشکِ خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوقؔ
یوں بھی دیکھا جہاں میں دوں بھی دیکھا

دنیا کے الم ذوقؔ اٹھا جائیں گے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
اب جائیں گے اوروں کو رُلا جائیں گے

دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت و سیاہ
وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بد اصل کو کیا نام خدا کوئی بنائے
بندوق کا توتا نہ کہے حق اللہ

اے ذوقؔ کرے گا کوئی دنیا کیا ترک
دنیا ہے بُری بلا ارے کیا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا
جب تک نہ کرے آپ اسے دنیا ترک

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہی کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہی تیرے منور سہرا

وہ کہے صل علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہی گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش ہی بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہی دمِ آرائش
سر پہ دستار ہی دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہی لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہی اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہی مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہی تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید و فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

دُرِّ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جن کو دعوا ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مثنوی

چاہیے نام اس کا اے خامہ
زینتِ نامہ زیبِ سرنامہ

ہی فلک اک نمونہ قدرت کا
یا قلمدان ہزار صنعت کا

رخ قرطاس کو صفائی دی
اور سیاہی کو روشنائی دی

دیا قمری کو مصرعِ نالا
مصرعِ قدِ سرو پر بالا

کی عطا نو خطوں کو کلکِ ادا
گیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا

نمک افشاں ہو عشق شور انگیز زخم دل کرتے ہیں بریز بریز
عکس ہو سبزۂ لب جو کا وسمہ قوس قزح کے ابرو کا

آئے گلشن میں فصل گل سو بار بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار
ساقیا جلد اٹھ درنگ نہ کر عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اتار لے شیشہ طاق پر رکھ کتاب اندیشہ
شیشۂ مے کی یہ دراز زباں اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں
میں ہوں مانند ساغر لبریز جان بلب، جاں بلب کو کیا پرہیز
جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے پانو توبہ کے لڑکھڑانے لگے
کردے یاں تک مجھے نشے میں چور تاکہ مانند خوشۂ انگور

ق

دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں

شب ہجراں بسر نہیں ہوتی نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
بستر رنج و کنج تنہائی رات کیا آئی اک بلا آئی
شام سے حال ہو یہ صبح تلک نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
گر لکھوں خط میں بے قراری دل نامہ بر ہو کبوتر بسمل
مضطرب اب جو ہو رہا دل ہی دل ہی یا مرغ نیم بسمل ہی
دل کی وا شد کیا کروں تدبیر غنچہ و گل ہی غنچۂ تصویر

جان بے تاب جیسی بے کل برق
وہ بھی گرمِ رہِ فنا کالبرق
نبضیں چھوٹی ہوئیں غشی طاری
ایک فرقت ہزار بیماری
دل سے رخصت ہو تاب طاقت کی
بے قراری نے استقامت کی
ہوسِ سیرِ باغ ہو کس کو
دل ہو کس کو دماغ ہو کس کو
کاٹ کھانے کو دوڑتا ہو گھر
سگِ دیوانہ بن گیا ہو گھر
اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت
تن بہ تقدیر سنگ آمد و سخت
ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر
رہوں دریا میں اور مگر سے بیر
ماہ بے مہر بلکہ دشمن مہر
ہر ستم میں ستم شریک سپہر

برق کا وہ ذرا چمک جانا
اور بغل میں ترا دبک جانا
فتنۂ استادِ نرگس فتاں
گردِ مژگاں ہجومِ شاگرداں
رخ تعالےٰ و زلف صلّ علیٰ
قدوہ سبحان ربیّ الاعلیٰ
زلف خوباں میں رخ کی براقی
کرے مشائیوں کو اشراقی
گو اُنا زُنگم نہ منہ سے کہے
لیک جاری زبانِ ہر مُو سے
مچھلی بازو کی یا ہو ذوالفین
غرقہ کش بحرِ فوں سے مردمِ عین
کمرو ناف اُن کے دلِ زار
رشتۂ کار و عقدۂ دشوار
رنگ پاں لعل روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر
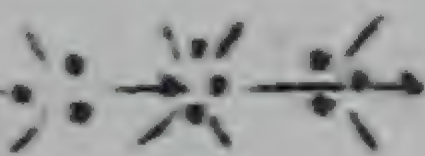
انتخابِ ظفر

یعنی

بہادر شاہ ظفر کے

آب دار دیوان کا انتخاب

جس کے ساتھ ظفر کی شاعری پر ایک بسیط مقدمہ شامل ہے

(شان الحق حقّی دہلوی)

ظفر کی شاعری

(کلام اور شاعرانہ شخصیت پر ایک داخلی نظر)

مغلوں کے آخری دور میں زبان و ادب کی ترقی تاریخ ادب کا خاص دلچسپ اور عجیب واقعہ ہے۔ یوں تو یہ بہرحال اپنے ہی دور کا ادب ہے اور اس عہد کے پورے خدوخال اپنے جملہ عیوب و صواب کے ساتھ اس میں جھلکتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس دور میں ہمارا ادب برابر ترقی پذیر رہا اور عام سیاسی پستی و ذہنی جمود کے باوجود جتنی کچھ جولانی وجودت، تنوع اور زندگی اس دور کی شاعری میں نظر آتی ہے، بجائے خود حیرت انگیز ہے۔

بہادر شاہ کا عہد کہ سیاسی اعتبار سے سلطنت مغلیہ کا دم واپسیں تھا، شعر و شاعری کے لیے بہارِ جاں فزا ثابت ہوا اور خود ظفر کے دیوان سے جس مذاق و مہارت کا پتا چلتا ہے، وہ اس کے پیش روؤں میں کسی کا حصہ نہ تھی۔

ظفر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ خوش نوایانِ سخن کی آزمائش گاہ اور زبانِ اردو کی ٹکسال تھا، قلعہ معلا میں دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتیں۔ اور اشعار کے دفتر کھلتے۔ ظفر بھی نوعمری ہی سے ان دلچسپیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور فطری لگاؤ کے باعث یہ مشغلہ اُن سے آخر دم تک نہ چھوٹا۔ خود کہتے ہیں ؎

طبیعت آدجواں پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی نہیں جاتی

بلکہ آخر زمانے میں اُن کی شاعری نے اپنا اصلی روپ دکھایا اور وہ آگ بھڑک اٹھی جس کی چنگاریاں اس سے پہلے بھی کہیں کہیں برآمد ہو جاتی تھیں ؎

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ
آگے تو شعلہ سا کئی بار اُٹھ کے رہ گیا

ظفرؔ ابتدا میں شاہ نصیر کے شاگرد رہے۔ دیوان اول کا بڑا جز انھی کا درست کیا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کی شاعری اُن دنوں شباب پر تھی۔ شاہ عالم بھی اُن کے قدردان رہے تھے اور اکبر شاہ ثانی بھی اُن سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اُن کے دکن چلے جانے کے بعد ظفرؔ کچھ دن میر کاظم حسین بیقرار کے شاگرد رہے۔ جب ۱۲۲۴ھ میں وہ بھی جان الفنسٹن کے میر منشی ہو کر ممالک سرحدی کی طرف دلی کو خیرباد کہہ گئے تو ذوقؔ سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ ذوقؔ کی وفات تک سینتالیس برس یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذوقؔ سے اپنی گہری خصوصیت کا ظفرؔ نے اُن قطعات تاریخ[1] کے علاوہ جو ذوقؔ کی وفات پر کہے اور بھی جگہ جگہ اظہار کیا ہے ؎

بے ذوقؔ ذرا لطف نہیں شعر و سخن میں — اس رمزِ نہانی کو کوئی پوچھے ظفرؔ سے
تیرا مذاق شعر ظفرؔ جانتا ہے کون — استاد ذوقؔ تھا ترا واقف مذاق سے
گیا لطف سخن تو ذوقؔ ہی کے ساتھ دنیا سے — جو تھوڑا سا رہا ہے اے ظفرؔ کچھ تو ہمیں تک ہے
بخشے ہے ظفرؔ اپنے یہ ذوقِ عجب دل کو — ہم ذوقؔ کا ہاتھوں سے دیوان نہ چھوڑیں گے

ایک اور جگہ کنایتاً کہتے ہیں ؎

شعر و سخن کا ذوقؔ مرے دل سے اُٹھ گیا — اک رہ گیا ظفرؔ جگر انجمن پہ داغ

ذوقؔ کے انتقال پر استاد شہ کی جگہ مرزا غالب کو ملی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ

[1] ذوقؔ کے مزار پر جو قطعۂ تاریخ کندہ ہے ظفرؔ ہی کا کہا ہوا ہے۔ لوح مزار بھی انھوں نے خود لکھ کر دی تھی۔

بزمِ سخن درہم برہم ہوگئی اور استادی و شاگردی کا سلسلہ ختم ہوا۔

زندگی کی آخری گھڑیاں رنگون میں گزاریں۔ شاعری یہاں بھی ضرور دم کے ساتھ رہی ہوگی اور اس پر ان سانحات کا پرتو ضرور بہت گہرا پڑا ہوگا۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا جو کلام ان سے منسوب ہے، اس کی تلخ نوائی جو کیفیت و اثر سے خالی نہیں، کافی معنی خیز اور محلِ نظر ہے۔

ظفرؔ اپنے عہد کے سب سے زیادہ پُرگو شاعروں میں تھے۔ بہت سی اصنافِ سخن پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

دیواں ظفرؔ کا دیکھ کے کاتب ہیں کہہ رہے لکھیں کہاں تلک ترے ہم کلیات کو

یہاں "کلیات" کا لفظ اپنے لغوی مفہوم سے کچھ زیادہ معنی رکھتا ہے۔ غزل کے علاوہ ترجیع بند، تضامین، مخمس، مسدس، مثلث، قطعات، رباعیاں۔ ایک آدھ سہرا اور پنکھا بھی کہا ہے۔ یہ بات جتانے کے قابل ہے کہ ان میں سے بعض اصناف خود ان کی ایجاد ہیں۔ دعا، حمد، نعت اور منقبتیں بھی موجود ہیں۔ اُردو کے علاوہ فارسی بھاشا اور پنجابی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غرض بہت بسیط و محیط کلام ہے۔ جس میں سے ایک دیوان بہت آب دار نکالا جا سکتا ہے لیکن یہ ذخیرہ اب تک بہت بے غوری کی حالت میں پڑا رہا۔ اُدھر مولانا آزاد نے تمام کلیات سرے سے ظفرؔ ہی کی نہ رکھی اور اُستادوں میں تقسیم فرما دی[1]۔ یہ اشتباہ بھی بڑی حد تک اس کلام کی طرف سے بے پروائی کا باعث ہوا۔ ذوقؔ کے جو یا اس لیے توجہ نہ کر سکے کہ مہر ظفرؔ کے نام کی لگی ہوئی تھی۔ اُسے کیوں کر توڑتے۔ اوروں نے اسے مشتبہ سمجھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو آبِ حیات۔ "بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم (ذوقؔ) کے ہیں۔"

غرض کلام کا اعتبار جاتا رہا۔

لہٰذا کلام ظفر کو روشنی میں لانے سے پہلے اس بحث کو چھیڑے بغیر چارہ نہیں۔ نہ اس مسئلے کی حقیقت حال کو معلوم کیے بغیر کلام سے پوری طرح لطف اندوز ہونا ممکن ہے۔ آب حیات کی روایت ہے کہ کلیاتِ ظفر کی جلد اول کا جزِ قلیل چھوڑ کر باقی تمام دیوان ذوق کے اصلاحی ہیں۔ اور اصلاح دراصل کہہ کر دینے کے مرادف تھی۔ انھوں نے اپنے اُستاد کے احوال میں جگہ جگہ کنایتاً یا صراحتاً اس بات کو جتایا ہے۔ چناں چہ کلام ظفر کی اصلیت اُردو شاعری کا ایک مستقل مسئلہ بن گئی ہے۔ ایک طرف آپ حیات کی کھلی روایات ہیں۔ لیکن دوسری طرف اتنے بڑے ذخیرہ کلام کی ملکیت کا مسئلہ بھی یقیناً ذرا زیادہ تامل چاہتا ہے۔ اس طرح جو باتیں اس نظریے کو جوں کا توں مان لینے میں مانع نظر آتی ہیں ان کا اظہار کر دینا لازم ہے بلکہ ان پر اصرار بھی۔ ان میں خارجی اور داخلی دونوں طرح کے قرائن شامل ہیں گو جیسا کہ ابتداً کہا گیا اس مقدمے کا اصل مقصد کلام کا داخلی مطالعہ ہے۔

آزاد کی یہ بات شروع ہی سے کچھ دل کو نہیں لگتی کہ ظفر جیسا موزوں طبع شیدائی سخن جو ساری عمر فنا فی الشعر رہا اور جس میں شاعری کا پورا ذوق اور کافی لیاقت موجود تھی، ساری عمر شعر گھڑنے کے قابل نہ ہوا ہو اور ذوق کی نولہ ربائی پر اس درجے مجبور ہو۔ ظفر کا افسانۂ زندگی خود ایک مکمل المیہ ہے۔ اسے عمر بھر شاعری کے لیے سازگار محرکات میسر رہے۔ شعر گوئی کے لیے اُسے کافی فرصت و فراغت حاصل رہی اور دل پر صدمے اور جھٹکے بھی اس قدر پڑ چکے تھے ؎

دل رنجور کو میرے غمِ الفت نے ظفر
صدمے پر صدمے دیے جھٹکے پہ جھٹکے لاکھوں

پھر اگر اساتذہ کرام بھی بانوے برس میں اس کے کلام کو درست نہ کر سکے تو خود اُن کی استادی پر حرف آتا ہے! (وہ استاد جنھوں نے دلی کے کنجڑوں

اور حجاموں تک کو اصلاح سے بے نیاز کر دیا تھا) خود مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"مرزا ابوظفر ولی عہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوے، شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔" مکرر:

"بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا۔ اس کا کیا ہوا انھیں سنبھالنا پڑتا تھا۔" اگر مولانا آزاد اپنا بیان یہیں تک رکھتے تو چنداں ردّ و کد کی ضرورت نہ ہوتی مگر اُن کے کچھ اور بیانات دیکھیے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ولی عہد کی غزل بھی بناتے تھے اور جب جدا جدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولی عہد کا۔ اسی طرح ہر شاگرد کلام بعد اصلاح کے اپنے اپنے رنگ پر تھا اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ۔"

زیادہ مشکوک نگاہوں کو شاید یہاں بھی مبالغے کا شائبہ نظر آئے۔ مگر دوسری جگہ تحریر فرمایا ہے:

"وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا۔ اب اگر نئی غزل کہہ دیں اور اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا ستر برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے بہتر کہیں تو اپنے کیے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں بادشاہ کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کے شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوش طبع ہو ادھر ہی آجائے۔"

یہ نکتہ لائق غور ہے کہ ایک طرف تو مولانا دونوں شاعروں کے انداز سخن کے فرق کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں کہ ذوق کو ہر رنگ پر قدرت حاصل تھی۔

گویا ظفر کے کلام کی انفرادی خصوصیات اور دونوں کے انداز کلام کے فرق کا فائدہ بھی ذوق کو پہنچا اور دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ ذوق اپنا ہی کلام بجنسہ بادشاہ کی نذر کر دیتے تھے اور تمام جوش طبع ظفر کے نیگ لگ جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس طرح دونوں کلاموں کا امتیاز کیا باقی رہ سکتا تھا۔ برخلاف اس کے ذوق اور ظفر کے کلام میں بہت کچھ امتیاز موجود ہے جس کے قائل آزاد بھی نظر آتے ہیں بلکہ انھوں نے ذوق کے رنگ کو "سب سے الگ" بنایا ہے۔

اسی طرح یہ بیان بھی مبالغے سے خالی نہیں معلوم ہوتا کہ "ستّر برس کا سخن فہم" بیگانہ غزلیں اپنا کر بچوں کی طرح بہل جاتا ہوگا اور ذوق کے تمام زور طبع کو سمیٹنے کی خاطر ایسا ہی التزام رکھتا ہوگا۔ ذوق اپنی غزلیں اُن سے چھپاتے ہوں گے اور ظفر اُسی طرح ہیں کہ کر اس ترکیب سے اُن کی غزلوں پر ہاتھ مارا کرتے ہوں گے۔

کہا جا سکتا ہے کہ استادوں سے غزلیں کہوانے کی عادت بعض اور رئیسوں کو بھی رہی ہے لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ ظفر کے ذوق سخن سے اوروں کو کوئی نسبت نہیں تھی۔ ان میں کوئی اس درجے شعر کا "عاشق شیدا" نہیں گزرا۔ یوں بھی بہادر شاہ بہت ہنرمند آدمی تھا۔ منجملہ اور فنون کے شطرنج اور خطاطی میں اس کی مہارت مشہور تھی۔ اغلب یہی ہے کہ اس میں وہ غور اور تحمل موجود تھا جو ایک با مذاق سخن داں کو مصرعے موزوں کرنے اور انتخاب الفاظ کے لیے درکار ہوتا ہے۔ ظفر خود قائل ہیں ؎

اے ظفر اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو
نہ تو بل پیر کا کام آئے نہ استاد کا بل

ایک اور جگہ مولانا آزاد لکھتے ہیں: "نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اِدھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔" واقعہ یہ ہے کہ ظفر کی عمر

اس وقت ذوق سے کم و بیش دوگنی تھی۔ گویا مولانا نے التزام جوانی پر اُس کنارے سے نظر ڈالی۔ ذوق کی تاریخ ولادت ۱۲۰۴ھ ہے اور ظفر کی ۱۱۸۹ھ۔ اس طرح دونوں کی عمر میں پوری ایک جوانی کا فرق نکلتا ہے! کچھ اسی قسم کی واردات آب حیات میں نواب الٰہی بخش معروف کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ جب ذوق مشکل سے ۱۸ برس کے ہوں گے تو ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی۔ آزاد نے ذوق کو ان کا استاد بھی بنایا ہے۔ اس کی تردید "نیر درخشاں" اور احمد سعید خاں طالب نے خود مولانا آزاد سے بحث و تمحیص کے بعد "بہ براہین قاطع" کر دی تھی۔ (خمخانۂ جاوید)

دراصل بعض قرائن و شواہد کی رُو سے یہ دعوا بھی قابل قبول نہیں کہ یہ تمام کلام ذوق کا اصلاحی ہے۔ ذوق کی وفات تک ظفر کا چوتھا دیوان تو یقیناً اور تیسرا دیوان بھی غالباً مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے اس سے بڑھکر کیا دلیل ہوگی کہ نہ صرف دیوان چہارم بلکہ دیوان سوم میں بھی حسن اتفاق سے ظفر نے اپنے استاد کو یاد کیا ہے اس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں یہ شعر دیوانِ سوم کا ہے ؎

تیرا مذاق شعر ظفر جانتا ہے کون　　استاد ذوق تھا ترا واقف مذاق سے[1]

اسی طرح دیوان اوّل بھی (الا قلیلاً نصفہ) آب حیات کی آیۂ کریمہ کے مطابق ذوق ہی کا ہے۔ اس پر ذوق نے نظر ثانی ضرور کی ہے اور اس کا ایک نسخہ (مطبوعہ ۱۲۴۳ھ) انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے جس پر تحریر ہے "بہ تصحیح استاد ذوق" لیکن اغلباً یہ ذوق سے سلسلۂ تلمذ شروع ہونے سے پہلے ہی مکمل و مرتب ہو چکا تھا، جیسا کہ مولوی امیر احمد علوی نے لکھا ہے[2]۔ آب حیات کے بموجب یہ تلمذ اس وقت

---

[1] مطبع احمدی بمبئی کے نسخے میں یہ شعر یونہی درج ہے لیکن نول کشور کے ایک نسخہ میں "تھا" کی جگہ "ہے" چھپا ہوا ملا۔ ممکن مصرعے کی تحقیق نسخوں کی اصل کا پتا لگانے سے ہو سکتی تھی مگر اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب "بہادر شاہ ظفر" ہمیں دیوان اول میں دو تاریخیں ملتی ہیں ایک کا سن ۱۲۲۳ھ نکلتا ہے (ع زد راب رنگیں یہ سنا سر بسر دیوان ہے) اور ایک کا ۱۲۲۴ھ (سراپا یک قلم دیوان بستان معانی ہے)

شروع ہوا جب سندھ اور کابل سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدنامے ہوئے اور بیقرار میر منشی ہو کر ہوگئے یعنی ۱۸۰۹ء یا ۱۲۲۴ھ سے ذوق نے اصلاح دینی شروع کی لیکن ظفر کا پہلا دیوان ۱۲۲۳ھ میں ہی مکمل ہو چکا تھا یعنی اس کے متعلق قطعۂ تاریخی کی صورت میں ہاتف غیبی کی شہادت ردیف تی میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ خود کلام کے تجزیے اور نفسیاتی تحلیل سے جو شہادت ملتی ہے وہ اس قدر صریح ہے کہ کسی تاویل وحجت کی ضرورت نہیں رکھتی۔ خالص غزل و تغزل تھوڑی دیر کو خارج از بحث سہی، لیکن وہ کلام جو ظفر کی شخصی واردات کا ترجمان ہو اور جس میں اس کی ذہنی و قلبی کیفیات کا عکس نظر آئے، اس مسئلے میں آپ اپنا گواہ قرار دیا جا سکتا ہے (گو یہ اب تک کلیات کی ضخامت میں گم رہا) اس کی مزید تفصیل آیندہ صفحات میں ملے گی۔ یہاں چند موٹی موٹی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہی شعر دیکھیے ؎

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

نصیر، بیقرار، ذوق، غالب ان میں سے کسی کے دن "جاہ و حشم" میں نہیں کٹے تھے۔ پھر کہتے ہیں ؎

بلا سے جاہ و حشم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو — نہیں ہے ہم کو بھی غم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو
غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم — ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
مرے زوال سے جانو کمال کو میرے — زوال یہ ہے تو ہوگا کمال کیسا کچھ!
ہے ایک ایک سے لینا جہان کا بدلا — جنھوں نے رنگ مری عزت و شان کا بدلا!
اعتبار صبر و طاقت خاک ہے رکھوں ظفر — فوج ہندستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا
رہے جو عشق میں لب خشک چشم تر میری — خدا نے مجھ کو شہ بحر و بر بنایا تھا

کہے تھی شب نہ گل گیر شمع رو رو کر · وبال سر پہ مرے تاج زر بنایا تھا

اسی طرح ذیل کے شعر ان کی ذہنی کیفیات کا آئینہ ہیں۔ یہ مضامین کسی اور کے کوائف زندگی سے اس قدر مطابق نہیں کہے جاسکتے نہ ان مضامین کی نظیریں اوروں کے ہاں ملتی ہیں۔ خیالات کی عمومی روش کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے

اے ظفر اس وقت میں عزت ہی ذلت کا سبب · صاحب توقیر کی توقیر دشمن بن گئی

خدا کے رو بہ رو عزت رہے گو اہل دنیا نے · مری تعظیم کم کردی، مری توقیر کم کردی

جوشن جنگ و جدل پہنیں تو کس کے واسطے · ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کل اوڑھے ہوئے

جو ہونا ہے آخر وہ ہو کر رہے گا · کرے کون بخت آزمائی کا دھندا

ناحق ہیں ملے دوست رقیبوں میں ہمارے · ہووے گا وہی جو ہے نصیبوں میں ہمارے

جو کہ منظور اُسے ہے وہی ہووے گا ظفر · کیا کروں میں کہ مرے ہاتھ تو کچھ ہے ہی نہیں

نہ بدخواہوں سے ہوگا کچھ نہ ہوگا خیر خواہوں سے

جو کچھ تقدیر کی اپنی ہے گردش ہونے والی ہے

کھینچی جو تکلیف میں نے عشق میں وہ کاہے کو

ہے اذیت "مثل چرخ پیر" کھینچی اور نے

کیا وہ اس دور میں ساغر عشرت سے بھرے

کاسۂ عمر کو جو لاکھ مصیبت سے بھرے

کہاں عیش مجھ کو نہ عیاش سمجھو · تم اس غم زدہ کو نہ بشاش سمجھو!

اندیشۂ شب غم جائے ظفر نہ دل سے · عیش و طرب میں اپنا ہر چند روز گزرے

قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اِن میں سے ایک ایک مضمون کو ظفر نے بار بار باندھا ہے۔ اسی ضمن میں ذیل کے اشعار بھی قابل غور ہیں۔ بعض کنایات کو ملحوظ نہ رکھیے تو شعر بے معنی معلوم ہوتا ہے ہے

ای ظفر بس کیا بتاؤں تجھ کو "جو کچھ ہوں سو ہوں"
لیکن اپنے فخرِ دیں[1] کے کفش برداروں میں ہوں

سر پہ اپنے رکھ کے نعلین رسول مجتبےٰ شکر اللہ[2] ای ظفر ہم تاج داروں میں ملے!

بندۂ بادشاہ مطلق ہوں گرچہ رکھتا ہوں تاج زر ہوں کون؟
کوئی پہچانتا بھی ہی مجھ کو شاہ ہوں یا گدا ظفرؔ، ہوں کون؟

کون سی ہی بات ہم میں جس سے ہو موجودگی فضل سے اس کے ظفرؔ توقیر ہم جیسوں کی ہی

کیا کہوں بے دولتی و کم نصیبی اپنی میں
جب ہما پر ہاتھ ڈالا ہی تو زاغ آیا ہی ہاتھ

تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم؟
ہم ہیں جوں زلفِ عارضِ خوباں گو پریشاں ہیں خوش نما ہیں ہم
ای ظفرؔ پوچھتا ہی ہم کو صنم کیا کہیں بندۂ خدا ہیں ہم!

گُل گلزار ہوں تو یاں میں ہوں اور اگر خار ہوں تو یاں میں ہوں
کیوں کہ مجھ پر نہ سنگ باری ہو نخل پُر بار ہوں تو یاں میں ہوں
جتنے بد بیں ہیں ان کی آنکھوں میں ای ظفرؔ خار ہوں تو یاں میں ہوں

فکر ہی یہ ہی مجھے کیوں کر بچیں کے ان دنوں
ہم جو چڑھے نظروں میں یار و آہ اک عالم کے ہیں

کیوں وادیٔ وحشت میں نہ کھٹکا رہی مجھ کو ہر جھاڑ ہی دشمن مرا ہر خار مخالف
قسمت ہی مخالف ہی فقط عشق میں میری نی یار مخالف ہیں نہ اغیار مخالف

خاک اڑائی تھی اڑائی ہم نے مثل گردِ باد کچھ بلندی میں اٹھایا اور نہ پستی میں مزا

---

[1] مولانا شاہ فخرالدین

[2] یہ طفلانہ سادگی ادا ظفرؔ کی خصوصیت ہی۔ "شکر اللہ" خاص بچّوں کا کلمہ ہی۔

اس بلندی و پستی اور تاج و تخت سے متعلق بہت سے شعر کلیات میں موجود ہیں
ان میں سے ایک ایک ظفر کا کہا ہوا ہے۔ چند شعر دیکھیے ؎

شمع سے گلگیر کیا ہو تاجِ زر کی احتیاط
عشق میں حب ہو نہ اس سے اپنے سر کی احتیاط

یہ کہہ دو شمع سے گلگیر چھوڑنے کا نہیں
ارادہ اس نے ترے تاج زر پہ باندھ لیا

سر قلم ہوئے کا باعث ہی یہی بزم افروز
بہتر اس تاج سے یاں تو سر عریاں ہی شمع

شمع محفل نے کہا رو رو کے شب گلگیر سے
کیا وبالِ سر یہ میرا تاجِ زر پیدا ہوا

رہا سر پر ہمارے دو جہاں میں افسرِ شاہی
ظفر سر سے نہ اپنے مرشد کامل کا ہاتھ اٹھا

جو سمجھے کفشِ پائے فخر دیں کو تاج سر اپنا
پسند اس کو ظفر کب افسر شاہانہ آتا ہے

ملے گر بیٹھنے کو سنگ کوئے یار تو یہ دل
ابھی تخت شہی کو صورت ضیغم الٹتا ہے

یہ مضمون بہت ارزاں ہی کہتے ہیں ؎

کہا ہمیں حشمتِ شاہی سے محبت ہوئے
ای ظفر ہم تو فقیروں سے ہیں الفت رکھتے

جس کے گلہ فقر ظفر سر پہ ہو زیبا
وہ حال سمجھتا ہی نہیں تاج شہی کچھ

سریر سلطنت پر بیٹھتے آتا ہے ننگ اس کو
ترے کوچے سے ہے جو خاکسار اٹھا ہوا آتا

نہ ملازم ساتھ جائیں گے نہ چیلے جائیں گے
شاہ جائیں یا گدا یاں سے اکیلے جائیں گے

نو یاں سے جاکے پھر نہیں رہنے کا حکمراں
ہے تیری چند روز حکومت یہیں تلک

پھرا مہر زرد ار ہو کر جہاں میں
نصیبوں میں ہے اہلِ دولت کے گردش

غرض کہیں تخت و تاج کا مضمون بعنوان دگر نہیں بندھا ہے۔ منصب شاہی کی یہ بے تماشا مذمت جو ایسے درجنوں اشعار میں نظر آتی ہے اور خود ظفر کے ہاتھ پر کسی دربار ہی کی صلاحیت طبع سے بعید تھی۔ بلکہ خود ظفر کی نفسیات کی ترجمان ہے۔ اسی طرح وہ اشعار جن میں ظفر نے اپنے مصاحبین کو پھٹکارا ہے اور

اور ابنائے زمانہ کی خبر لی ہو ممکن نہیں کہ نذرانے میں پیش ہوئے ہوں ۔

دیتے ہیں توڑ کے ٹکرا سا مجھے صاف جواب ای ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

(ایسے مضامین کو ذوق یا غالب سے منسوب کرنا خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ ان کی شخصیت سے بھی بعید نظر آتا ہی)

ہیں لوگ دغا باز ہوئے گرد ہمارے محفوظ خدا رکھے ظفر ان کی دغا سے

مشہور بڑے دوست ہیں جو سب میں ہمارے
کرتے ہیں عداوت وہی مطلب میں ہمارے

پیچھے سنتے اُن سے کیا کیا ای ظفر کہتے ہیں وہ
کرتے ہیں جو آکے اظہارِ محبت رو بہ رو

ظفر ڈر اُن سے کہ ہی جن کے شیطنیت دل میں
اور اُن کی باتیں بہ ظاہر غریب کی سی ہیں

بہ ظاہر دشمنوں سے رکھتے تم اَن بن ہمارے ہو
مگر باطن میں دیکھا تو تمھیں دشمن ہمارے ہو

یار جو ملتے ہیں عیار ہی ملتے ہیں ظفر کیا کریں ان سے نہیں اپنی طبیعت ملتی

ہائے کہیے کسے یہاں اپنا کون اپنا ہی اور کہاں اپنا

کہیے اپنا کسے اپنا تو کوئی ہی ہی نہیں جو ہی بیگانہ ہمارا تو کوئی ہی ہی نہیں

دوست اپنے ہوے ظفر دشمن اس مصیبت کو کون پہچانے

ان اشعار کی خالص سادگی صاف اشارہ کر رہی ہی کہ زورِ طبیعت کے اظہار میں نہیں کہے گئے بلکہ ظفر کا تخیل اس کی اپنی زندگی کے مخصوص ماحول میں یا اس سے قریب تر پرواز کر رہا ہی۔ اس قسم کے اشعار دیوان میں بکثرت موجود ہیں۔ بعض جگہ تو پورے "قصیدے" نمک خوارانِ دولت کی شان میں پڑھ گئے ہیں ۔

کرتے ہیں ظاہر لطف و عنایت منہ کے ہیں یہ میٹھے نہایت
دل میں بھرا ہے ان کے سم یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے
قول و قسم سب ان کے غلط ہیں، اپنی غرض کے یار فقط ہیں
جانتے ہیں خوب ان کو ہم، یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے
کشتہ اگر ہو تیغ جفا سے کوئی انھیں کیا ان کی بلا سے
ان کو ظفرؔ ہے کس کا غم، یہ کس کے ہوئے اور کس کے ہوں گے

جتنی جتنی لوگ جتاتے اپنی یاری منہ سے ہیں
اتنی ان کی ہم بھی کرتے خاطر داری منہ سے ہیں
منہ کے میٹھے دل کے کڑوے اہلِ دُنیا دیکھ لیے
جھوٹی جھوٹی کرتے خوشامد آ کے ہماری منہ سے ہیں
دل میں بھرے ہیں ان کے لاکھوں بغض و عداوت کین و نفاق
کرتے ظاہر اپنی الفت اور غم خواری منہ سے ہیں
کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں ڈرتے رہیے ان سے ظفرؔ
دشمن جاں ہیں دل سے کرتے ظاہر داری منہ سے ہیں

اہلِ انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ ذوقؔ کے تخیل کی اوش یہ نہیں ہو نہ ہو سکتی تھی اور ظفر کا کوئی دیوان " سرتا پا حضرت مرحوم کا" نہیں ہو سکتا۔

اندازِ بیان کی طرف نظر کیجیے تو اس میں بھی اُس مماثلت کے باوجود جو پینتالیس برس کی ہم صحبتی و ہم مذاقی کا تقاضا ہونی چاہیے، بعض ایسے امتیازات موجود ہیں کہ ادا شناس نظروں سے نہیں چوک سکتے۔ وسیع تر مفہوم میں ذوق اور ظفر ایک ہی رنگ کے شاعر کہلائیں گے اور اس میں شک نہیں کہ ایسی صورت میں انفرادی تفریق اور بھی زیادہ موہوم ہو جاتی ہے کہ شاعری عنوانًا روایتی بلکہ روایات میں ڈوبی

ہوئی ہو۔ تاہم انفرادی امتیازات بالکل گم نہیں ہوسکتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ فنی اعتبار سے ذوق کا کلام بہ حیثیت مجموعی ظفر کے کلام پر فائق ہے۔ جہاں تک ندرت آفرینی پختگی بیان اور عالمانہ وسیع النظری کا تعلق ہے، ذوق کا دیوان استادی کا درجہ رکھتا ہے اور ظفر اُن کے شاگرد ہی قرار پاتے ہیں۔ لیکن ظفر کی شان امتیاز ان کی طبیعت کا وہ یاسیاتی رجحان ہے جس کا پرتو ان کی روشِ خیال ہی پر نہیں بلکہ روشِ گفتار، الفاظ اور لہجے پر بھی موجود ہے۔ اس یاس کوشی اور بے خروشی کا جوڑ ذوق کے ہاں بالکل موجود نہیں اور یہ اُس عہد میں صرف ظفر ہی سے مخصوص رہی۔ جو قنوطیت ظفر کے کلام کی جان وجو ہر نظر آتی ہے اُسے ذوق کے عام رنگ سخن سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اگر کہیں حسرت و یاس کے مضمون بھی باندھتے ہیں تو لہجہ مختلف اور بیگانہ ہوتا ہے۔ اُن کے کلام میں ایک زور اور لہجے میں ایک بلندی ہے جسے ظفر کی دل گیری و دل زدگی سے کوئی نسبت نہیں۔ نہ ایک کامیاب قصیدہ نگار شاعر سے اس لہجے کی توقع کی جاسکتی ہے جو اس قسم کی یاسیت کے لیے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ذوق:
نو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیّاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ظفر:
مرغِ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اُس قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ منع ہے

ان دو شعروں میں معنوی تعلق تھوڑا ہو یا بہت، لیکن کلام کے انفرادی رنگ میں تمیز ضرور کراتے ہیں۔ یہی بات دونوں شاعروں کے بہت سے قریب المعنی کلام پر صادق آئے گی ؎

ذوق:
یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

ظفر:- دیکھ کر سوئے چمن حسرت پرواز ہمیں
ہائے کیا کیا دم بے بال و پری آتی ہی

ذوق و ظفر کے کلام میں ایک نازک سا فرق اور بھی نظر آئے گا۔ ذوق اپنے مطالب کو تخیئلی مضامین کے طور پر باندھتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص انھیں شیخ محمد ابراہیم کی ذاتی واردات سمجھنے پر مجبور نہیں ہوتا۔ ان کا طبعی رجحان ہمارے نزدیک واردات نہیں بلکہ خارجی یا OBJECTIV شاعری کی طرف تھا۔ ظفر بھی شعوری طور پر ذاتیات کو شاعری سے علاحدہ رکھنے کے قائل تھے مگر اتنا محکم اختیار اپنے قلم اور طبیعت پر نہ رکھتے تھے۔ وہ یاسیت کے زیر اثر اکثر تغزل سے بہت دور پہنچ جاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی چور الیسارہ جاتا ہی جو کلام کے احوال واقعی ہونے پر دلالت کرتا ہی ؎

ذوق: کس دم نہیں ہوتا قلق ہجر ہی مجھ کو
کس وقت مرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا

" دم آیا ہی آنکھوں میں دم حسرت دیدار
پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا

ظفر: بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزش غم سے
مگر منھ سے نہ اُف ہم غم گساروں میں نکالیں گے

" عشق میں ایسی ہوئی ہی مجھ کو بے چینی نصیب
ظاہرا ہوں گرچہ میں سب کی نظر میں چین سے

ذوق: سدا تپش پہ تپش ہی دلِ تپاں کے لیے
ہمیشہ غم پہ ہی غم جانِ ناتواں کے لیے

" بیان دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زباں نہ دل کے لیے ہی نہ دل زباں کے لیے

ظفرؔ:
بھری ہے دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں
سنے یہ کون مصیبت کہوں تو کس سے کہوں
کسی کو دیکھتا اپنا نہیں حقیقت میں
ظفر میں اپنی حقیقت کہوں تو کس سے کہوں

ذوقؔ کا مشہور شعر ہے۔ ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہادیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آنا

ظفر کہتے ہیں۔ بہا اگر آنسوؤں کا آنکھ سے دریا تو کیا حاصل
فرو کب اس سے میرے دل کی سوزش ہونے والی ہے
نہ بدخواہوں سے کچھ ہوگا نہ ہوگا خیر خواہوں سے
مکرر ؎ جو کچھ تقدیر کی اپنی ہے گردش ہونے والی ہے

ظفرؔ واقعی جب روتے ہیں شبنم ہی کی طرح روتے ہیں۔ اُن کے دل و دماغ پر یاسیت کا ایک مستقبل پرچھانوا پڑا ہوا ہے جو آخری دیوان میں اور زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تڑپ اٹھتے ہیں ؎

لے دل کو نکال آہ کوئی چیر کے پہلو شاید مجھے آرام ظفرؔ ہووے تو یوں ہو

مکرر۔ ظفر کمال ہے تکلیف دل کے ہاتھوں سے
جو میرا بس ہو تو سینے سے دوں نکال کے پھینک

اُردو شاعری میں یاس پسندانہ مضامین عام ہیں لیکن یہ واردات نہیں، تخیلی شاعری یا افسانہ نگاری ہے۔ لہٰذا واردات کو پرکھنے کے لیے عام روایات غزل کی واجبی رعایت رکھنا اور اکثر شاعر کی سیرت و سوانح سے بھی سند لینا لازم ہوتا ہے۔ ظفر کے ہاں بھی ان کے فکر اور گفتار کی روش اور اس کا اُن کی زندگی اور معلومہ شخصیت سے بدیہی تطابق ہے جو اُن کی یاسیت کو پُر معنی بناتا ہے۔ لیکن

خیالات وجذبات کی نوعیت اور طرزِ کلام دونوں کے اعتبار سے ظفر کی یاسیاتی شاعری اپنے ہم عصروں سے واضح طور پر امتیاز رکھتی ہے۔ غالب کے ہاں یاسیت جس قدر بھی ہے اپنی گہرائی کے سبب ظفر کی یاسیاتی شاعری سے ممتاز ہے۔ بلکہ ان کی حسرت بھی اکثر بہجت وخیامیت کا پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ظفر کہتے ہیں تو یوں کہتے ہیں ؎

ہم کہاں اور کہاں خانۂ رنگینِ جہاں
دیکھ لیں اور کوئی دم ہے تماشا باقی

نغمہ ہائے غم کا اچھوتا تخیل اور سازِ ہستی کا بے صدا ہو جانا یہ پیچیدہ اور پُرکار تصورات ابوظفر کے میدان سے باہر ہیں۔ وہ غم کو غم ہی سمجھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اس کی طرف سے بے حس ہو سکتے ہیں۔ غم اگر انھیں نغمے کی صورت میں بھی نظر آ سکتا تو کلام میں یہ افسردگی اور پژمردگی نہ آنے پاتی۔ اس کے علاوہ ان کی یاسیت سراسر ذاتی مصائب کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انھوں نے زندگی پر ہمدردانہ اور مشفقانہ نظر تو ڈالی مگر فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ مسئلہ حیات کو نہیں دیکھا۔

ذوق کے کلام کو کسی عنوان قنوطی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ طبعاً قناعت پسند ہیں۔ اُن کی زندگی میں کوئی خاص کش مکش نہیں پائی جاتی۔ ذوق زندگی کے حوادث کی تاویل کرتے ہیں، اس سے انکار نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہاں تیری یا میری دانش وری نہیں چلتی۔ ظفر کے ہاں بھی اس درویشانہ قناعت پسندی کا ایک دور آتا ہے مگر ان کے ہاں یہ مضامین کورا ایمان اور محض قولِ مرشد کی تکرار ہیں۔ اس کی نفسیاتی توجیہ بھی دشوار نہیں۔ وہ عافیت پسند چاہے ہوں اور آخر عمر میں تو ضرور ہو گئے تھے۔ لیکن طبعاً قانع وبے نیاز واقع نہیں ہوئے تھے۔

بہت سی حسرتیں اور خلشیں جنم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں انھیں صدمے اور جھٹکے اسی لیے سہنے پڑے کہ ان کی حسرتیں اُن کے حوادث سے ٹکراتی تھیں مگر انھیں اپنے کوائفِ زندگی سے مجبور ہو کر بے اختیاری کا نام توکل اور مجبوری کا نام صبر رکھنا پڑا اور شاید ایک عمر میں اپنی طبیعت کو اس شیشے میں اُتار بھی لیا۔

ذوق کے ہاں نہ تو وہ پژمردگی ہے جو آتشِ حسرت کے بھڑک کر بجھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے، نہ زندگی سے لطف اندوزی اور اس کے عیش و غم کو یکساں طور پر منانے کی وہ صلاحیت کہ غم بھی کبھی نغمہ بن کر دکھائی دے سکے اور سعیٔ بے حاصل میں بھی لذت محسوس ہو۔ البتہ ذوق نے مسائل زندگی کو ضرور چھوا ہے یعنی ان کا کلام فکر سے خالی نہیں۔ گو وہ زندگی کو کسی اچھوتے زاویے سے نہیں دیکھتے۔ ہاں شاعر ہیں اور اپنے مشاہدات و تاثرات کو نئے انداز اور تخیل کی آمیزش کے ساتھ بیان کرنا جانتے ہیں۔ ذوق کہتے ہیں ؎

ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بہ وقت مرگ

غالب نے بھی کہا ہے ؎

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر

ظاہر ہے کہ غالب کی نظر زندگی کی سطح میں ایک درجہ زیادہ گہری گئی ہے۔ اس کے علاوہ غالب اس حسرت ناک حقیقت کے احساس کے باوجود دوسرے مصرع میں شوخی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

ظفر کے متعلق یہ کہنا بجا ہو گا کہ ان کے ہاں تفکر اور خیال کی گہرائی موجود نہیں وہ خود کہتے ہیں ؎

دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں جزو کل کو نہیں سمجھتا ہوں

ان کے ادنا کلام کا ذکر نہیں، اُن کے منتخب کلام میں بھی لطافت ہے،

گھلاوٹ ہے - جذبات ہیں اور تاثیر بھی ہے - مگر گہرائی و گیرائی نہیں کلام آپ کے گدگداتا ہے آپ میں ایک کیفیت بھی پیدا کرتا ہے اور آپ کے لہجے کو بھی بدل دیتا ہے - مگر آپ کی بصیرت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا - ذوق کے ہاں غور و مشاہدہ موجود ہے، ظفر کے ہاں جو کچھ ہے وہ بین و بیان، ظفر جگہ جگہ آنسو بہاتے ہیں، ذوق کہیں بھی آنسو نہیں بہاتے - "احوال شب ہجر" والے قطعے کو دیکھیے - ہجر کا موضوع اور اس پر یہ عالم "کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے!"

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے الخ

کون کہہ دے گا کہ ذوق اس وقت رو رہے ہیں یا کسی کو رُلانا چاہتے ہیں؟ ظفر کا شعر ہے ؎

یار نہیں، غمخوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیئے دل کو مرے بہلائے کون!

یہ ایک باریک نکتہ ہے کہ ذوق جب کبھی خالص شخصی و نجی قسم کی واردات نظم کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں وہ سنجیدگی نہیں پیدا ہونے پاتی جو زندگی کے زیادہ وسیع حقائق کو نظم کرتے وقت پیدا ہوتی ہے - برخلاف اس کے ظفر کا تمام پُر تاثیر کلام خالص نجی قسم کی واردات پر مبنی ہے ؎

کبھی جس نے کہانی تیرے آگے اس نے اوروں کی
کہا تجھ سے یہاں اپنا فسانہ ہے تو ہم نے ہے

ذوق کی سنجیدہ گفتاری کے نمونے آپ کو ان اشعار میں ملیں گے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہی یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے | پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہی ساتھ | تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق | اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

ذوق کے ہاں عالمانہ وسعتِ نظر ہی۔ ان کی شخصیت زیادہ پختہ ہو چکی ہی۔

بقول اقبال ؎

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہی | یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہی

ذوق محاورے کے استاد ہیں۔ اُردو شاعری میں باقاعدہ محاورہ گوئی کی طرح دراصل انھی سے پڑی۔ ظفر بھی انھی کے ہم مذاق تھے بلکہ یہی اس زمانے کا چلتا ہوا رنگ تھا۔ غالب بھی اس کوچے میں قدم رکھے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن کلام ظفر کو کہیں سے دیکھیے یہ نکتہ واضح طور پر نظر آئے گا کہ اُن کے "روزمرّہ" کا اصل لطف محاورات کے چسپاں کرنے میں نہیں۔ ان کی نظر بول چال کے قرینوں پر زیادہ رہتی ہی۔ وہ اپنے کلام میں گفتار کا مزا پیدا کرنے کے لیے بندھے بندھائے محاوروں کے علاوہ دوسرے تیوروں کو بھی کام میں لاتے ہیں، جن میں سے بعض انھی سے مخصوص ہیں۔ ظفر کی فصاحت میں ان کا انفرادی رنگ اس قدر گہرا اور نمایاں ہی کہ اداشناس نظریں اُن کی ہر غزل کو دور سے پہچان سکتی ہیں۔ اُن کے سامنے نہ ان کے بعد کوئی عین اس رنگ کا لکھنے والا نہیں ہوا۔ ان کی خودساختہ زمینیں۔ اُن کا مخصوص تیور، لہجہ اور لغت آپس میں اس قدر گہرا ربط و توافق رکھتے ہیں کہ ایک بالکل منفرد "نظامِ فصاحت" کے اجزا معلوم ہوتے ہیں اس کی مثال میں پوری کلیات سے کم کچھ پیش نہیں کیا جاسکتا، تاہم یہاں ان کے مخصوص تیوروں کے چند نمونے دیکھیے ؎

ہمیں ہر بات پر دیتے ہو صاحب گالیاں اوہو!
تصدق اس زباں کے تم بھی یہ سیکھے زباں اوہو!

مرا کہنا کہ کیا عالم ہی تجھ پر واہ وا صدقے!

اور ان کا ناز سے ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں، اوہو!!

جی میں کیا تیرے سمایا اسے کیا کہتے ہیں ہم سے ہر وقت کنایا یہ اسے کیا کہتے ہیں!

پوچھا ہر چند بھرے کان تمھارے کس نے نہ بتایا نہ بتایا، اسے کیا کہتے ہیں!

دیکھتا ہوں خواب میں اس یوسف ثانی کو میں
مجھ کو سوتے سے عزیزو مت جگاؤ، کون ہی!

دل اُن کی زلف سے الجھا وہ ہم سے اس لیے الجھے
یہ قصہ فی الحقیقت ای ظفر یوں تھا سنا یوں ہو

غم کو چھوڑوں کس طرح گر آشنا ہی تو یہی اب بُرا ہی تو یہی ہی اور بھلا ہی تو یہی
میں نے اُس قاتل سے پوچھا آج کیا دل میں تیرے قتل کا میرے ارادہ ہی؟ کہا ہی تو یہی!

نزاکت کیا کہوں دل کی عجب نازک کلی ہی دل
سخن کی اک ذرا گرمی سے جو کمھلائے، ایسی ہی!

ذوقؔ کی وفات سے اختتام حکومت تک ظفرؔ نے مرزا غالب سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھا۔ در اصل "استادِ شہ" ایک منصب بن کر رہ گیا تھا چناں چہ بہادر شاہ کے ہاں بھی نصف صدی سے زیادہ کی مشقِ سخن کے بعد استاد کی جگہ خالی تھی لیکن کسی ایک غزل پر بھی مرزا کے تلمذ کا اثر نہیں۔ وہی یک رنگی ظفرؔ کے تمام دیوانوں میں موجود ہی جس کا سلسلہ کہیں قطع نہیں ہوا۔ بہ الفاظ مولانا حالی: "ظفرؔ کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہی۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

"یادگارِ غالب" میں جو حالیؔ نے بادشاہ کی اصلاحِ کلام کے متعلق ایک روایت نقل کی ہی، اس پر دھوکا کھانا لازم نہیں۔ اول تو یہ مولانا حالیؔ کا نہیں، ناظر حسین مرزا

کا بیان ہی جو حالی نے غالب کی زود گوئی کے مذکور میں ضمناً دہرا دیا ہی۔ ظاہر ہی مولانا حالی کو خود غالب سے کچھ کم تقرب نہ تھا۔ پھر ان کو کسی اور کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت رہی؟ ناظر حسین مرزا نے صریحاً مبالغے سے کام لیا ہی۔ بات ایک منھ سے دوسرے منھ تک پہنچنے میں بدلتی بھی ضرور ہی۔ تاہم مولانا حالی نے آبِ حیات کی روایت کی کوئی تصدیق اپنی جانب سے نہیں کی۔ البتہ راوی کا بیان نقل کر کے کہتے ہیں کہ "اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرزِ خاص میں لکھتے تھے، نظم ہو یا نثر، اس کو بڑی کاوش اور جاں کاہی سے سرانجام کرتے تھے۔ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، اس وقت انھیں فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔"

یہ تو مولانا حالی کو بھی تسلیم ہی کہ ظفر کا کلام غالب کی "روشِ خاص" سے مختلف ہی۔ فی الواقعہ ظفر کا جو تھا دیوان جو بلا شبہہ غالب کے زمانۂ استادی کا ہی، سب کا سب ظفر کے مخصوص رنگ میں ہی۔ یہ رنگ مرزا غالب کے مذاق سے تو بعید ہی ہی اُن کے قلم سے بھی دور تھا۔ اگر مرزا کے قلم کو اس رنگ پر ایسی ہی قدرت ہوتی تو یقین ہی (تفننِ طبع ہی کے لیے سہی) وہ خود بھی ایسی بہت سی غزلیں چھوڑ جاتے۔ یہ رنگ اُن کے ہم چشموں میں مقبول اور خود بادشاہ کو مرغوب تھا۔ عجب نہ تھا کہ مرزا اپنے حریفوں کو اُنھی کے میدان میں نیچا دکھاتے۔ اپنی روشِ خاص کے خلاف چلنا اہلِ کمال کو سازگار نہیں ہوتا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ غالب نے اس رنگ کو جہاں کہیں آزمایا ہی بیگانہ رہے ہیں۔ "لگن کے پانو" کی قسم کی غزلیں غالب کا ادنا ترین کلام ہی۔ خود بادشاہ کی فرمائشی زمینوں میں بھی غالب نے اپنے ہی مخصوص رنگ کی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً یہ غزل[1]

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

---

[1] یہ طرحی غزل ہی مقطع یہ ہی:
مجھے جنوں نہیں غالب و لے بقولِ حضور "فراقِ یار میں تسکین جو ہو تو کیوں کر ہو"

پوری غزل پڑھ جائیے ؎ "غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا" نہ مانے دیدۂ بیدار تو جو کیوں کر ہو۔
یہ کلام ظفر کے طرزِ گفتگو سے جو اختلاف رکھتا ہے اسے جتانے کی ضرورت نہیں۔ نوعِ تخیل، بندشِ مضمون، انتخابِ الفاظ غرض ہر اعتبار سے یہ غزل ظفر کے کلام سے منزلوں دور ہے۔

دیوان حالی کے مقدمے میں مولانا حالی نے خود ظفر اور ذوق کے کلام میں تمیز کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "ذوق کی غزل میں زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے۔" لہٰذا اغلباً ان غزلوں پر جن کا ناظر حسین مرزا نے تذکرہ کیا غالب نے چند منٹ میں صرف اصلاحی نظر ہی ڈالی ہوگی۔

آبِ حیات سے قطع نظر، ظفر کے عہد یا زمانہ مابعد کے کسی تذکرے میں ان کے متعلق اس سوئے ظن کا اظہار نہیں ملتا۔ ان کے اقتباسات غیر ضروری ہوں گے اسلئے حذف کیے جاتے ہیں۔ اس تمام بحث کے بعد اس شبہہ کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ کلام ظفر سراسر متاع بردہ ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں ظفر بہت اچھی مہارت سخن نہ رکھتے ہوں لیکن ساری عمر اس حماقتِ محض میں مبتلا رہنا کہ دوسروں سے غزلیں کہوا کر فرمایشی مشقِ سخن کے ڈھیر لگاتے رہیں، قرین قیاس نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ذوق کی اصلاح سے ظفر کے کلام کو جلا ضرور ہوئی اور دیوانوں کی موجودہ شکل ان کی حکّ و اصلاح کے بعد پیدا ہوئی ہوگی۔ بعض قافیے بھی اپنی طرف سے پُر کر دیے ہوں اور کبھی کچھ شعر بھی اصلاح کے ساتھ داخل کر دیتے ہوں تو تعجب نہیں۔

در اصل ظفر کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا نتیجے دار ایک حد تک نیرنگ زمانہ

بھی ہی۔ یہ ایک نکتہ ہی کہ اُس دور کے بعض لکھنے والوں نے اس کارخانے کے اُجڑ جانے کا کوئی ملال اپنی تحریر سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور ظفر کا نام جہاں لیا ہی نہایت رکھے پن سے لیا ہی۔ اس طرح ظفر کی شاعری اور شخصیت دونوں پر ایک عرصے تک مصلحت وقت کا "کیمو فلاج" پڑا رہا۔

اب ہم موضوعات سخن کے لحاظ سے ظفر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ظفر کا تغزل ظفر کی بیشتر شاعری اُردو کے روایتی تغزل پر مبنی ہی جو اُس دور میں جہاں سے ظفر کی شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔ روایات میں اور بھی زیادہ محصور ہو کر خالص لفظی صناعی (VERALART) بن گیا تھا۔ عہد ظفر میں دلی کی بزم سخن لکھنؤ سے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی۔ ناسخ کا رنگ قبولیت حاصل کر رہا تھا۔ غالب کے بعض شاگردوں تک نے ٹھیٹھ لکھنوی شاعری کی ہی۔ شاہ نصیر اس طرز کے پیشرو تھے۔ ظفر کو اول اول انھی سے تلمذ رہا۔ اور ان کی شاعری کا بیج بھی اسی زمین میں بویا گیا۔ چنانچہ اُن کا ایک بہت بڑا جزو کلام خارجی شاعری، محاکات، سراپا نگاری، معاملہ بندی وغیرہ پر مشتمل ہی۔ رعایت لفظی کے کافی شوقین ہیں۔ گو ہمارے نزدیک وہ اس رنگ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتے تاہم اکثر جگہ انھوں نے اسے بڑی کامیابی سے نباہا ہی۔ ظفر کے تغزل کا ایک رُخ اس قسم کے اشعار میں نظر آتا ہے ؎

بلا یہ کون لیتا اپنے اپنے سر لیتے۔ تو ہم لیتے ۔۔۔ بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ بوسہ اس کے لب کا ای ظفر لیتے تو ہم لیتے ۔۔۔ لگا یا جام جو ہونٹوں سے اس نے ہم کو رشک آیا

جلایا آپ ہم نے ضبط کرکے آہ سوزاں کو

جگر کو سینے کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو

جگہ جگہ کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے گر قاتل

کٹاری کو چھری کو بانک کو خنجر کو پیکاں کو

ناخن پہ رفتہ رفتہ تری سرخیٔ حنا   تصویر ماہِ نو ہے کامل پہ بن گئی

تڑپیں جو دی وفا نے تو میرے لہو کی چھینٹ   بوٹی سی ایک دامنِ قاتل پہ بن گئی

رُخ پہ بالا کان کے بالے میں ہیں گوہر کئی

چاند پر ہالہ ہے اور ہالے میں ہیں اختر کئی

اُن کے ہاں ادا بندی سراپا نگاری اور معاملہ بندی سے لے کر ضلع جگت تک سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کی تفصیل طول چاہتی ہے۔ البتہ ان کے آرٹ کے کچھ اور پہلوؤں کو دیکھیے۔ محاکات کی بعض جگہ خوب داد دی ہے۔ اس صنف میں اُن کے بعض اشعار ضرب المثل ہیں اور اُردو کے منتخب اشعار میں شمار ہونے کے لائق۔ گو بیش تر کلام لفاظی سے پُر ہے اور ایجاز و اختصار کم ملتا ہے، مگر بعض موقعوں پر چند سہل و سادہ الفاظ میں نہایت مکمل اور موثر تصویر کھینچ کر دکھائی ہے

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشم تر او ہو ہو!   خون جگر، آہا ہا! لخت جگر او ہو ہو!!

جنوں کی کتنی موثر تصویر ہے۔ ایک دیوانے کی شکل آنکھوں میں پھر جاتی ہے کہ اپنے دامن پر خون دل اور لختِ جگر دیکھ کر والہانہ قہقہے لگا رہا ہو۔

مرا کہنا کہ کیا عالم ہے تجھ پر واہ و صدقے!

اور ان کا ناز سے ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں؟ او ہو!!

ہم نہ سمجھے تیوری پر اس قدر کیوں بل دیے   اور پھر کیوں مسکرا کر آپ چپکے چل دیے

دو مصرعوں میں اتنی تفصیلات ہیں کہ خاصی متحرک تصویر بن گئی ہے۔ حیرت کا رنگ اس پر مستزاد ہے

کیا کیا وہ ہمیں دیکھتے ہیں دھیان سے بیٹھے   ہم پوچھتے ہیں اشک جو دامان سے بیٹھے۔

کیفیات کی عکاسی کے کچھ اور نمونے دیکھیے ؂

ظفر دامانِ مژگاں ہی سے ٹپکا جائے ہی آنسو
اگر پہنچا سکے آنکھوں تلک تو آستیں پہنچا!

خاصی کیمرے کی جھپکی ہی - ظفر کی محویت ہی نہیں، ناطاقتی کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہی اور بالکل نادانستہ طور پر ؂

رونا میرا پوچھتے کیا ہو آنکھ سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصور اور بندھا ہی ایک زرا چپ رہنے دو!

کچھ تو جانا اُس نے اپنے غم کے پابندوں کا حال
اک زرا چھلا جو کل انگشتِ پا میں پھنس گیا!

دل ہاتھ میں اس کا لیا پر ہی یہ ظفر حال
جنبش میں رہے جیسے کہ ساغر کے تلے ہاتھ!

ایجاز کی ایک اور مثال ہی ؂

نہیں قلقل دعا دیتا ہی شیشہ دم بہ دم ساقی
سبو کو خم کو مے کو مے کدے کو مے پرستاں کو

شعر کی ترنم آفرینی سے قطع نظر، لفظ "دم بہ دم" کو دیکھیے کہ ایک طرف قلقل مینا کی نقل صوت ہی تو دوسری طرف گرمیٔ محفل کا بھی اظہار کرتا ہی، گویا گردشِ ساغر تیز ہی! ؂

چیدہ چیدہ مہ جبیں اچھے جو دل بُردہ سے ہیں
ہم سے کچھ چیں بر جبیں رہتے ہیں آزردہ سے ہیں!

لطف یہ ہی کہ ان میں سے ایک پاس ہی بیٹھے ہیں - مخاطب ہیں مگر مذکور نہیں! گویا شعر دراصل معاملہ بندی میں ہی ؂

خارجی صناعی کے ساتھ ظفر کا کلام جذبات سے بیگانہ نہیں، بلکہ جذبات

ہی کی آمیزش سے اُن کے آرٹ میں جان پیدا ہوتی ہے۔ درصل ذوق، شاہ نصیر اور جرأت کا کلام بھی جذبات سے خالی نہیں تھا لیکن ظفر کی جذباتیت ان سے زیادہ شدید ہے۔ البتہ اس عالم میں اکثر تغزل کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ان کا موضوع محبوب نہیں رہتا، وہ خود بن جاتے ہیں۔ بہر حال یہاں اُن کے خاص تغزل سے بحث ہے جس کے ضمن میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ بھی جذبات کی چاشنی رکھتا ہے۔ ظفر کو جذبات کے اظہار پر کافی قدرت حاصل تھی۔ ایسی زمینوں میں بھی جہاں جذبات نگار کے قدم نہیں جم سکتے، انھوں نے بڑی کامیابی سے جذبات نگاری کرکے دکھائی ہے۔ بیشتر کلام ان کا عام واردات عشق و محبت سے پُر ہے۔ ظفر کے تغزل کا دوسرا رُخ اس قسم کے اشعار میں نظر آئے گا۔

رہتا زباں پہ آٹھ پہر کس کا نام ہے؟ ... کرتا ہے یہ جو دل میں اثر کس کا نام ہے
بدنام ہے جہاں میں ظفر جن کے واسطے ... وہ جانتے نہیں کہ ظفر کس کا نام ہے

وہ دیکھ لیتے ہیں جو ادھر کچھ نہ کچھ تو ہے ... ہو جاتی دل کو دل کی خبر کچھ نہ کچھ تو ہے
وحشت ہے یا جنوں مجھے پر تیرے عشق میں ... پھرتا ہوں یوں جو خاک بسر کچھ نہ کچھ تو ہے

بات کرتی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی ... جیسی اب ہے تری محفل میں کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار ... بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
نگہ یار کو اب کیوں ہے تغافل اے دل ... وہ ترے حال سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی

دن اور ہو رات اور زمیں اور زماں اور ... رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں ہے وہ جہاں اور
محفل سے اٹھا غیر کو اور اس کے عوض تو ... رکھ دے مری چھاتی پہ کوئی سنگ گراں اور

ہماری تنقیدوں میں اب تک آرٹ پر زیادہ توجہ رہی، شاعر کی نفسیات پر کم۔ خصوصاً غزل گو شعرا کے جذبات و مطالب کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی، نہ دریافت کیا جائے کہ ان مضامین اور ان جذبات کی تحلیل و تجزیے سے وہ واردات جن میں تخیل ہی بھی

جو نفسیاتی نکات برآمد کیے جا سکتے ہیں وہ کھلی کھلی واردات میں نہیں مل سکتے۔ ظفر کے خالص عاشقانہ جذبات کا مشاہدہ بھی ان کے خواص طبیعت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعے کے بعد جو تاثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں، اُن میں اُن کی شخصیت کا کافی واضح خاکہ موجود ہے۔

تصوف ظفر کا دوسرا موضوعِ سخن تصوف ہے اور تغزل کے بعد ان کے کلام میں سب سے زیادہ متصوفانہ اشعار ہی کی بہتات ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جامِ شراب
مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

چناں چہ ظفر کے ہاں خمریات کا اتنا زور نہیں، جتنا تصوف کا ہے۔ دراصل تصوف اور شعر گوئی دونوں ظفر کے لیے جائے گریز کا حکم رکھتے تھے۔ اپنے مادّی ماحول میں ان کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے "دولتِ فقر" کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر یہ بھی اُن کی پہنچ سے باہر نکلی۔ چناں چہ ظفر کا مایۂ زندگی حسرت زدگی ہی رہی اور انھیں اس کا شدید احساس بھی تھا ؎

ازل سے ہم تو غم آلودہ اک جہاں کے رہے
رہے اسی میں یہاں کے رہے نہ واں کے رہے

تاہم آخر عمر میں انھیں کچھ آسرا تھا تو روحانیت کا ہی رہ گیا تھا یہی ان کی واحد خلش تھی اور یہی ذریعہ تسکین ؎

وہ دولت دے خدا ہو تاجور جس سے دو عالم میں
فقط دنیا میں زیبائش ہے تاج بادشاہی کو

ہے وقار اہلِ جاہ و حشمتِ دنیا کچھ اور　　　اور اہلِ فقر کی توقیر ہی کچھ اور ہے

غنچے جگائے فتنۂ خوابیدہ حرص نے
سب آ کے میرے کنجِ قناعت میں سو گئے

ظفرؔ جو ہو گئے ہیں آشنا دیں کی لطافت سے
لگا ئیں منھ وہ کیا دنیا کو، یہ آخور دنیا ہے

یہ وہ مقام نہیں "کہ کام نہ لیے دل لگی چلے" اس قسم کے بیسیوں اشعار اسی ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ظفر نے روحانیت کی تحصیل میں اپنی سی سعی بھی کی تھی۔ نو عمری ہی میں مولانا شاہ فخر الدین سے بیعت ہوئے اور گو اُن سے زیادہ عرصے فیض یابی کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اُن کے بعد اُن کے صاحب زادے مولانا قطب الدین اور پوتے نصیر الدین عرف کالے صاحب سے بھی برابر عقیدت و مودّت جاری رکھی۔ ظفر نے بے شمار اشعار ان بزرگوں، خصوصاً "اپنے فخرِ دیں" کی شان میں کہے ہیں اور طرح طرح اپنی بے پایاں عقیدت و محبّت کا اظہار کیا ہے ؎

مرید قطبِ دیں ہوں خاکِ پائے فخرِ دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں، اُن کا غلام کم تریں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
و لیکن اے ظفرؔ ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

ظفرؔ دشوار ہے ہر چند اہلِ معرفت ہونا
مگر صدقے میں فخر الدین ہاں ہو سکتا ہے سب کچھ

بعد میں ظفر نے خود بھی مریدوں کو بیعت کرنا شروع کر دیا تھا اور لوگ بڑی تعداد میں ان کی مریدی اختیار کرنے لگے تھے۔ لیکن اس کا سبب ان کے رشد و کمال پر اعتماد کے ساتھ کچھ ان کی مرید نوازی بھی تھی۔ لال قلعے میں روحانیات کے باقاعدہ درس بھی ہونے لگے تھے اور ظفر خود سعدی کی گلستاں کے روحانی رموز و نکات بیان فرماتے تھے۔ ظفر کی تصانیف میں شرح گلستانِ سعدی بھی شامل ہے جو ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی دہلی سے چھپی تھی۔ روحانی ریاضتوں کے باب میں ایک رسالہ "سراج المعرفت" بھی مفتی میر لال سے لکھوایا تھا۔ ظفر کی دین داری و پرہیزگاری کا اعتراف بعض ہم عصر شعرا نے بھی کیا ہے۔

رند کہتے ہیں ؎

ناغہ ہو جائے ذکر کیا ہے قرآن ابوظفر بہادر

مرزا غالب نے بھی مہر نیم روز کے دیباچے میں ان کی تصوف پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

شاہ ما وارد بہم در رہبری خرقۂ پیری و تاج قیصری

شاہی و درویشی ایں جا باہم است بادشاہ عہد قطب عالم است

مہ نو والے قصیدے میں پھر کہتے ہیں ؎

چشم بد دور خسروانہ شکوہ لوحش اللہ عارفانہ کلام

اسی طرح اپنے مشہور قطعۂ تہنیت میں بھی ظفرؔ کی دین داری ہی کا اظہار کرتے ہیں ؎

کیوں نہ ہو خلق کو خوشی غالبؔ شاہ دیں دار نے شفا پائی

اپنے کلام میں ظفر نے جگہ جگہ تحصیلِ معرفت کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ وہ بے تاب نظر آتے ہیں کہ کوئی صاحب نظر ان کی دست گیری کرے اور دولتِ عرفان حاصل کر سکیں ؎

نہ ہو دامِ علائقِ جسم اگر کروں عالمِ قدس کی سیر ظفرؔ

کوئی ایسا ہو کامل پاک نظر کہ جو قید ہے اس سے چھڑائے مجھے

ایک اور جگہ کمال سادگی سے کہتے ہیں ؎

یہ جو پڑا ہے پردۂ غفلت اپنے دیدۂ دل پہ ظفرؔ

کوئی اگر وے اس کو اٹھا، کیا اچھا ہو، کیا اچھا ہو!!

لیکن متصوفانہ کلام کا بیش تر حصہ انھوں نے باکمال صوفی کی حیثیت سے نہیں محض ارادت مند کی حیثیت سے کہا ہے۔ انھیں صاحب کمال ہونے کا مطلق

دعوا نہیں ہے۔ جو کچھ ہے، تحصیلِ عرفان کی آرزو اور "عالم قدس" کی سیر کا ارمان ہے اور کسی صاحبِ کرامت کے متجسس نظر آتے ہیں جو انھیں یہ منازل طے کرا دے۔ اس قسم کی تعلّیاں ظفر کے کلام میں نام کو نہیں جو روحانیت پسند شاعروں کے ہاں عموماً پائی جاتی ہیں۔ وہ طور اور موسیٰ سے چشمک بھی نہیں کرتے۔ بلکہ روحانی معاملات کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ ایک شعر بھی اس قسم کے مضمون کا ظفر کے دیوان میں موجود نہیں۔ یہ نکتہ ان کے کلام کے خلوص کی دلیل ہے۔ انھیں صاف طور پر اعتراف ہے کہ ؎

خوب ڈھونڈا خوب دیکھا کچھ نظر آیا نہیں
آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں

چشمِ ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا ہے یار
تم نے بھی اے دل کی آنکھوں اس کو دکھلایا نہیں

انھیں صرف روشن ضمیروں سے یہ خبر پہنچی ہے کہ عرفان ذات بھی کوئی چیز ہے، جس سے وہ محروم رہے، اور دل میں بھی کچھ نظر آسکتا ہے۔ البتہ ایک موہوم سی توقع آخر دم تک لگی رہی اور اسی پر شاید ان کا سہارا تھا ؎

صبر کر صبر کہ اے دل تجھے کچھ ہونا ہے
ہو نہ بے تاب کہ حاصل تجھے کچھ ہونا ہے

اے ظفر پیشِ نظر یار کی تصویر کو رکھ
اس کے ہونے سے مقابل تجھے کچھ ہونا ہے

غفلت کا ظفر پردا اٹھ جائے جو آنکھوں سے
آجائے تماشا پھر کیا کیا نظر او ہو ہو!

یہ تماشا انھیں کبھی نظر نہ آیا اور اسی حسرت کو لیے ظلمت کدۂ عدم میں جا بسے ؎

دیکھا نہ تجھ کو ہم یونہی محروم ہی چلے
آئے تھے تیری دید کو کس اشتیاق سے

ظفر نے تصوف کے مسائل پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہ بھی ان کی روحانی ریاضت کا ایک جز تھا۔ یہ گویا سبق ہیں جو انھوں نے اپنے دل کو دیے ہیں۔ وحدت الوجود کے مسئلے کو بہت جگہ نظم کیا ہے ؎

شعلہ ہو وہی شمع وہی ماہ وہی ہو خورشید وہی نور سحر گاہ وہی ہو
مجنوں و خراباتی و دیوانہ و ہشیار درویش و گدا شاہ و شہنشاہ وہی ہو
خارا میں شرر ہو وہ ظفرؔ لعل میں وہ رنگ واللہ وہی سب میں ہو باللہ وہی ہو

اس قسم کے اشعار سے کسی اونچی پہنچ کا نہ سہی مگر ایک جذب و کیفیت کا ضرور اظہار ہوتا ہے ؎

ارض و سما خورشید و قمر ماحور و ملک اور جن و البشر
پڑھتے ہیں دل سے آٹھ پہر الّا اللہ الّا اللہ!

وہی یہاں ہے وہی وہاں وہ ہی نہاں ہو وہ ہی عیاں
رکھیے ہمیشہ ورد زباں الّا اللہ الّا اللہ!

ہر شے میں ہی تو جلوہ نما واحد و شاہد اللہ ترا جلوہ ہے کیا واحد و شاہد
سب رنگ ترے اور ترا رنگ نرالا تو سب میں ہے اور سب سے جدا واحد و شاہد
پردے کو دوئی کے جو در دل سے اٹھایا بے پردہ تجھے دیکھ لیا واحد و شاہد

ظفرؔ کا فلسفہ تمام تر مستعار تھا۔ تاہم بعض نظریات ان کے دل کو لگ گئے تھے اور ایمان بن گئے تھے۔ انھی میں سے ایک "انسان" کی اہمیت بلکہ عظمت کا اعتراف ہے جو انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے: الانسان ھو العالم الاصغر کے نظریے پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کے اس مستزاد کے چند شعر ہمارے انتخاب میں شامل ہیں ؎

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے دیکھ آنکھ کھول کر
کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے پر چاہیے نظر

ہر چند کہ اُن کی نظر اس حیرت کدے میں بھٹکتی ہی رہی اور انسان کی حقیقت بھی کچھ سمجھ میں نہ آئی جس کا خود انھوں نے سادگی سے اعتراف کیا ہے ؎

ظفر ہی خاک کا پتلا یہ انسان پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے!

لیکن ان کے دل نے انھیں سمجھا رکھا تھا کہ ؎

عالم صورت میں تو میں صورتِ آدم میں ہوں
عالم معنیٰ میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

اب تو ہے اُس جانِ جہاں کو خوب طرح سے جان لیا
بھیس میں ہائے آدم کے آیا ہم نے بھی پہچان لیا

وہی سادگی ادا ملحوظ رہے! در اصل ان کی سادگی تمنا کسی "پیکر محسوس" کی تلاش میں تھی اور یہ انھیں انسان ہی میں نظر آیا۔ صوفیا کا صاد اس پر پہلے سے موجود تھا۔ چناں چہ انسان کے مرتبے کو اکثر جگہ بہت بلند و بالا بنایا ہے۔

ظفر کے صوفیانہ کلام میں بعض جگہ خواجہ میر درد کا رنگ جھلکتا ہے اور وہی اندازِ کلام کی کسی قدر معصومانہ سادگی پائی جاتی ہے جو درد کے نشتروں کا جوہر ہے۔ صوفیانہ مضامین کو ادا کرتے وقت لہجہ نہایت سنجیدہ ہو جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ شعر خلوص سے کہا گیا ہے۔ اُن کا یہ کلام رعایت لفظی، محاورہ بندی اور اس قسم کی دوسری مصنوعات سے یکسر مبرا ہے۔ ان کی بے تکلفانہ سادگی کی مثالیں زیادہ تر انھی اشعار میں ملتی ہیں۔

اخلاقی و ناصحانہ شاعری

ظفر کی شاعری کا یہ پہلو بھی توجہ کے لائق ہے۔ کچھ اس لیے نہیں کہ یہ بہت رفیع و بلیغ کلام ہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ اخلاقیات ان کے محبوب موضوعات میں سے ہے۔

ادب میں ناصحانہ شاعری کچھ مستحسن نہیں سمجھی جاتی۔ در اصل سب سے پہلے انگریزی کے "رومانوی" شاعروں نے سابقہ کلاسکی دور کی دوسری خصوصیات کے ساتھ ان کی اخلاقیات سے بھی دل برداشتگی کا اظہار کیا۔

لیکن ہمارے خیال میں شاعری کا سب سے بڑا قصور کوئی موضوعی نقص نہیں بلکہ فی الجملہ آرٹ کی کمزوری ہی۔ اٹھارھویں صدی کے انگریزی شعرا کا قصور یہ نہیں تھا کہ انھوں نے اخلاقیات کو موضوع بنایا بلکہ ان کا آرٹ فرسودہ اور بے کیف ہو گیا تھا، ورنہ اخلاقیات بلکہ مقصدیت خود ورڈز ورتھ کی شاعری میں بھی موجود ہی جو "رومانوی" دور کا امام اور رومانیت پسندوں کا محبوب شاعر ہی۔ بہرحال ظفر کی اخلاقی شاعری کے بارے میں اس بحث کو چھیڑنا ناحق اُسے کانٹوں میں گھسیٹنا ہوگا کہ اسے اپنے اس کلام میں نہ آرٹ کا دعوا ہی نہ تبلیغ کا۔ وہ کیٹس کے الفاظ میں کوئی "بیّن منصوبہ" (PALPABLE DESIGN) سامنے رکھ کر شعر نہیں کہتا بلکہ بہت خلوص و سادگی سے محض اپنے اخلاقی اصولوں کو قلم بند کر دیتا ہی اور یہاں کلام کی سچائی بجائے خود ہمارے لیے کافی ہی۔

ظفر نے خود بھی اپنی شاعری میں زیادہ تر خلوص ہی پر زور دیا ہی۔ یہی ان کی اخلاقیات کا لبّ لباب ہی۔ خاص طور پر وہ خلوص جس کی ضد بغض و بدخواہی ہی ؎

دیکھ آئینہ صفت ساتھ صفائی کے ہمیں — روشِ کینہ و آئینِ کدورت سے نہ دیکھ

اسی غزل کا مطلع ہی ؎

کون کہتا ہی کہ شوخی و شرارت سے نہ دیکھ — دل کو لیکن نظرِ دزدی و غارت سے نہ دیکھ

یہ تمام غزل اخلاقی پند و نصائح سے پُر ہی۔ ملاحظہ کیجیے ظفر کے اخلاقی چٹکلے ؎

جو کہ ہو تجھ سے سوا تو اسے حسرت سے نہ دیکھ — اور جو تجھ سے ہو کم اُس کو حقارت سے نہ دیکھ

زالِ دنیا تجھے سو جلوۂ عروسانہ دکھائے — ہی جواں مرد اگر، تو اسے رغبت سے نہ دیکھ

دیکھیں کیا گلشنِ ہستی کو کہ کہتی ہی خزاں — تو بہار اس کی بہت بیٹھ کے فرصت سے نہ دیکھ

دیکھ تو ہمتِ عالی سے بشر کا رتبہ — مرتبہ اُس کا بلندیِ عمارت سے نہ دیکھ

ذوق کا مشہور شعر ہے ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

دونوں شعروں کا مضمون ایک ہے لیکن یہاں "پست قامت" کا ٹکڑا اور وہاں "بلندیٔ عمارت" کا جملہ اپنی اپنی نسبت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ظفر کے دوسرے معقولات و منقولات کی طرح اُن کا نظام اخلاق بھی مستعار اور محض روایتی ہے۔ اس میں کوئی ندرت۔ گہرائی یا بلندی نہیں پائی جاتی۔ ہمت عالی کو سراہتے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ جب شعارِ زندگی توکل اور گوشہ نشینی ٹھیرے تو یہ ہمت عالی آخر کس حوصلے پر صرف ہو۔ دنیا اور اس کے مشاغل کی مذمت میں بے حد زور قلم صرف کیا ہے ؎

دنیا والو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوتی نیک انجامی ہے

خوش رہتے ہیں مشغول جو ہیں حرص و ہوا میں
اپنے تو حواس اُڑتے ہیں دنیا کی ہوا سے

کوچۂ حرص میں لے جائے نہ انساں کو خدا
کہ وہاں تو سگِ دنیا ہیں بھنبھوڑے کھاتے

ایک ہو تو کہیے، ہیں دنیا کے دھندے سیکڑوں
اور ہر دھندے میں ہیں آفت کے پھندے سیکڑوں

کوچۂ تنگ ہے دنیا میں نہیں آرام کی جا
یاں کوئی پاؤں نہ پھیلائے تو کیا اچھا ہو

کیا غارت ہزاروں کو ظفرؔ دنیا کی دولت نے
بڑی آفت ہے یہ دنیا معاذ اللہ معاذ اللہ!

فنا کے خوف سے بہت ڈراتے اور کارِ دنیا کو ہیچ بتاتے ہیں۔ بغض و کینے کی مذمت، خلوص دل، خلوص نیت اور خلوص نظر کی تلقین، دل دکھانے کی برائی۔ غرور و تکبر کی تحقیر، غرض پندِ پیر ناصح دیکھنا ہو تو یہاں دیکھیے

ظفرؔ وہ زاہدِ بے درد کی ہو حق سے بہتر ہے
کرے جو رند دردِ دل سے ہاو ہوئے مستانہ

دل نہ رنجیدہ کرے کوئی بڑا ہے یہ گناہ اور دنیا میں ظفر تقصیر جو چاہے کرے

یارو! سفر کا کچھ سروسامان تو کرو جانا کہاں ہے تم کو ذرا دھیان تو کرو

کس سوچ میں ہو راہ کے توشے کا کرو فکر اے غافلو نزدیک ہے وقت سفر آیا

پیغام قضا شام نہ آیا سحر آیا

وہم کی راہ نہیں اے دلِ آگاہ ہے ٹھیک راہ جو صدق و صفا کی ہے وہی راہ ہے ٹھیک

دل گدا کا ہو جو دولت سے قناعت کی غنی شاہ کیا بلکہ اُسے کہنا شہنشاہ ہے ٹھیک

بُرا وہ ہے حقیقت میں جو سمجھے آپ کو اچھا

بُرے سب سے ظفر ہم ہیں بُرا ہم کس کو کہہ بیٹھیں

بلا سے کوئی گر بُرا یا بھلا ہے ہمیں کام کیا اور تمھیں کام کیا ہے

ظفر اب کسی کی بُرائی بھلائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

ظفر ر با وہ بشر خوب اوّل و آخر جو خاک سمجھے ہوا خاکسار پہلے ہوا

میرے نزدیک ظفر بادہ پرستی اچھی پر نہیں ہے مئے پندار کی مستی اچھی

ہر چند کچھ وہ ہووے واللہ کچھ نہیں ہے

سمجھے ظفر جو انساں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

جانتے ہیں اہل دنیا جیسی پڑھتے ہیں نماز

پر بلا سے سرکشوں کا سر ذرا جھکتا تو ہے

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یہ شعر ان کا ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اکثر طویل قطعے اور ترجیع بند وغیرہ بھی اخلاقیات کے موضوع پر موجود ہیں۔ ان کے تصوف کی طرح یہ کلام بھی سادگی و بے تکلفی میں مثال ہے۔

اسی سلسلے کا ایک موضوع اور ہی جسے مذہبیت کہہ سکتے ہیں۔ اس ذیل میں
اُن کی بہت سی نعتیں، منقبتیں، حمدیں اور دعائیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرف
ظفر کی طبیعت متواتر اور دوسرے موضوعات کی نسبت زیادہ مسلسل طور پر رجوع
ہی۔ اِکا دُکا شعر سے لے کر بڑی بڑی نظموں اور قطعوں تک اس عنوان پر موجود ہیں
یہ کلام ان کی اس عقیدت واردات روشنی ڈالتا ہی جو انھیں اپنے مذہب اور اکابر
دین سے تھی۔ یوں تو ظفر نے جگہ جگہ اپنے آپ کو صلح کل بتایا ہی (اور صلح کل وہ ضرور تھے)
مذہبی تفریق کو غلط قرار دیا ہی اور صرف حق پرستی کا دعوا کرتے ہیں ؎

ہو صلح کل اے دل کہ سب اُٹھ جائے لڑائی کافر نہ مخالف ہو نہ دیں دار مخالف

نہ تو کچھ کفر ہی نہ دیں کچھ ہی ہی اگر تو ترا یقین کچھ ہی

کرتے غرّے سے جو یہ دعویٰ ایماں ہیں ہم
کفر یہ ہی اسے توڑیں تو مسلماں ہیں ہم

چار عنصر کے احاطے میں ہی کچھ جلوہ عجیب
دیر و مسجد کی الگ یہ چاردیواری ہی اور

بت پرستی جس سے ہو وے حق پرستی اے ظفر
کیا کہوں تجھ سے کہ وہ طرزِ پرستش اور ہی

مئے وحدت کی ہم کو مستی ہی بت پرستی خدا پرستی ہی

لیکن واقعہ یہی ہی کہ وہ دل سے بہت سیدھے سادے مسلمان تھے یہ اشعار
اُن کے تصوف کے آموختے میں شامل ہیں جس کی رُفت و بود کا سبق وہ ساری عمر
لیتے رہے۔ کلام اُن کے مذہبی عقائد پر کافی روشنی ڈالتا ہی۔ بعض اشعار سے
معلوم ہوتا ہی کہ وہ کچھ تفضیلیت کی طرف مائل تھے بلکہ ایک مرتبہ تو دلّی میں اُن کے
باقاعدہ طور پر شیعہ ہو جانے کی افواہ بھی اُڑ گئی تھی جس کی انھوں نے بعد میں تردید کرا دی

تھی۔ ایک شعر میں اپنے عقائد کو یوں صاف کیا ہے ؎

فدائے چار یار و خاک پائے پنجتن ہوں میں

ظفر میرا تو مذہب یہ ہے اور ایمان و دیں یوں ہے

ایک اور ترجیع بند میں کہتے ہیں ؎

تھا ابوبکرؓ یارِ غارِ نبیؐ	تھا عمرؓ گرمِ کاروبارِ نبیؐ
اور عثمانؓ جاں نثارِ نبیؐ	اور علیؓ وہ کہ رازدارِ نبیؐ

میرا حامی ہے پیشوا ہے علیؓ!

میرے ہر درد کی دوا ہے علیؓ!

بہر حال ظفر کو حضرت علیؓ اور اہلِ بیت سے بہت عقیدت اور محبت تھی۔ اکثر جگہ امداد و معاونت کے لیے انھی سے التجا کی ہے ؎

مستغنیٔ کونین ہی رکھ اپنے ظفر کو	محتاج نہ کر حیدرِ کرارؓ کسی کا
آئیے اب تو مدد کے واسطے بہرِ خدا	یا حسینؓ ابنِ علیؓ بندہ بہت لاچار ہے

گر جا و ثاتِ دہر سے غم ہے نوائے ظفر

کر جا کے التجا شہ خیبر شکن کے پاس

چند سلام اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ اسی طرح آں حضرتؐ کی شان میں بھی بہت سے نعتیہ اشعار اور طویل نعتیں موجود ہیں مثلاً ؎

اے سرورِ دو کون و شہنشاہ ذوالکرم	سرخیلِ مرسلیں و شفاعت گرِ امم
تو واں سریرِ اوجِ رسالت پہ جلوہ گر	آدم جہاں ہنوز پسِ پردۂ عدم
والیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا	والشمس تیرے روئے منور کی ہے قسم

اسی طرح کچھ مدحیہ اشعار کے بعد کہتے ہیں ؎

تیری جنابِ پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض	صدقے میں اپنی آل کے اے شاہ محتشم

صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دُور کر
آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم

پہنچا نہ آستان مبارک کو تیرے میں
اس غم سے مثل چشمہ ہوئی میری چشم نم

پر خاک آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ میل تصور سے دمبدم

اس نعت کو ظفر نے قصیدے کا رنگ دے دیا ہے اور وہی شکوہ لفظی پیدا کرنا چاہا ہے۔ چناں چہ اس کا انداز ان کے عام انداز سے کچھ مختلف نظر آتا ہے عجب نہیں کہ اس میں ذوق کا قلم شامل ہو۔ یہ دیوان اول کے شروع میں حمد سے پہلے وارد ہوئی ہے۔ اُستاد ذوق کی تصحیح سے پہلے اغلبًا دیوان حمد ہی سے شروع ہوتا ہوگا۔ اس کی مضمون آفرینیاں اور بعض ترکیبیں ظفر کی روش سے بالکل مختلف اور دیوان میں اجنبی معلوم ہوتی ہیں مثلاً ؎

رنگ وجود سے ترے گلشن رخِ حدوث
نورِ وجود سے ترے روشن دلِ قِدَم

ٹوٹا جو کفر قوتِ اسلام سے تری
صد جلوے سے شکستہ ہے زنارِ موجِ یم

"آستانِ مبارک" کی زیارت کا ارمان اور بھی بہت جگہ کیا ہے مثلاً اس شعر میں (اور یہی کلیات ظفر کا عام انداز ہے) ؎

ہم جو کعبے جائیں گے تو واں سے ہو کر اے ظفر
پھر مدینے کو نجف کو کربلا کو جائیں گے

کیا سادگی تمنا ہے! مگر یہ بھی ان کی بہت سی حسرتوں کے ساتھ رنگون میں دفن ہوئی۔

بہت سی منقبتیں اولیائے کرام کی شان میں بھی لکھی ہیں جن میں اکثر اپنا دکھڑا خاصا دل کھول کر رویا ہے ؎

رکھتا وظیفہ اپنا یہی صبح شام ہوں
یا پیر دستگیر تمہارا غلام ہوں

تم ہو اے خواجہ معینِ سروران حق پرست　　تم ہو رمز آگاہ کن اور واقف سرِّ الست
تم مددگار ظفر ہو کیوں ظفر کو ہو شکست　　پر فلک کی دیکھ گردش کانپتے ہیں پاؤ دست

یا معین الدین چشتی دستگیری لازم است　　الخ

ہم ظفر کے ان موضوعات کو اس لیے زیادہ لائقِ توجہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کا بہت پُرخلوص کلام ہے اور ایک طرح ان کی 'واردات' ہی کی ذیل میں شامل صوفیانہ اخلاقی اور مذہبی کلام کی شان بتاتی ہے کہ یہ دادِ سخن دینے کے لیے نہیں کہا گیا۔ اور ہر چند کہ سخن آفرینی میں ظفر سے بہت لوگ بلند و بالا ہیں۔ خلوص نگارش میں کم لوگ اُن کے برابر نکلیں گے۔ آرٹ، خصوصاً وہ جس کی تعریف میں صنعت کو زیادہ اور بلندی کو کم دخل ہے ہمارے دیوانوں میں بہت ارزاں ہے لیکن واقعیت اتنی ہی کم یاب ہے۔ لہذا ظفر کا خلوص گفتار نظر انداز ہونے کے لائق نہیں۔

واردات و یاسیت اس موضوع پر پچھلے صفحات میں بھی کچھ روشنی پڑ چکی ہے۔ لہذا یہاں ان کی نفسیات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ درصل ظفر اپنے دکھ درد کا بیان اپنی حیثیت کے منافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے جگہ جگہ خود کو اس سے باز رہنے کی تلقین کی ہے سے

محبت میں گو لاکھ صدمے ہوں دل پر　　ظفر کچھ نہ نکلے خبردار منھ سے
ظفر کہتے ہو کیا دل کی حقیقت　　کسی محرم سے جو گزرے سو گزرے

جل جائے تپ غم سے ظفر جان بلا سے
پر اُف نہ کریں سوختہ جانی کی قسم ہے

نہ کہوں گا نہ کہوں کا کبھی کیفیت دل　　ملک الموت کو پہلو میں بٹھا لوں تو کہوں
ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غم کہہ نہیں سکتے　　پر جو سبب غم ہے وہ ہم کہہ نہیں سکتے
کرتا ہو جہاں کچھ بھی ترا کار نہ کہنا　　بہتر ہے وہاں کہنے سے سو بار نہ کہنا

غلط ہی جو یہ کہیے چپکے رہنا کچھ نہیں اچھا

نہ کہنے ہیں مزا ہی منھ سے کہنا کچھ نہیں اچھا

انھوں نے اپنی شاعری کو واقعات زندگی کے اظہار کا ذریعہ نہ بنانا چاہا اور اس پر تغزل کا ایک جھرجھرا سا پردہ ڈالے رہتے ہیں۔ تاہم شعر کیفیت قلبی کے اظہار سے کیوں کر باز رہ سکتا تھا۔ بہ قول انھی کے ؎

ظفر شعر و سخن سے رازِ دل کیوں کر نہ ہو ظاہر

کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

چناں چہ ایسے اشعار بہ کثرت موجود ہیں، جن میں اُس ذہنی کیفیت کا پتا چلتا ہی جو اُن پر اپنے بھرم کو قائم رکھنے میں گزری ہوگی بلکہ اس کے تمام مدارج کا ریکارڈ موجود ہی ؎

بھر آیا دل مرا سو بار پر نہ رویا ہیش رہا یہ مدِّ نظر پاسِ آبرو سے لحاظ

شرمِ مردم سے ظفرؔ رو نہیں سکتا دن کو

ہر ہی تنہائی میں راتوں کو مقرر روتا

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزشِ غم سے

جگر منھ سے نہ اُف ہم غم گساروں میں نکالیں گے

غمِ پنہاں کو مرے کون بشر جانتا ہی میرا دل جانتا ہی میرا جگر جانتا ہی

بھید دل کا گریے سے اے چشمِ نم کھل جائے گا

وہ جو ہی پوشیدہ اپنا حالِ غم کھل جائے گا

ئتے جو ہم نہیں منھ سے کچھ اس میں بھید ہی — بولنا اچھا نہیں سارا بھرم کھل جائے گا

ہیں گرچہ مثل شمع سراپا زبان تو کیا — کہہ سکتے پر زباں سے نہیں اک سخن ہیں ہم

ہم دمو مثل صورت تصویر — کیا کہیں تم سے بے صدا ہیں ہم

آگے چل کر اپنی اس خموشی کی داد بھی طلب کرنے لگتے ہیں۔ گویا:

"وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا!" ؎

پچھ کہہ نہیں سکتا ہوں زباں سے کہ ذرا دیکھ

کیا جائے ہی جس جائے نہ کچھ دم زدنی ہی!

و علیٰ ہٰذا القیاس ؎

عشق میں ایسی ہوئی ہی مجھ کو بے چینی نصیب

ظاہرا ہوں گرچہ میں سب کی نظر میں چین سے

کہاں عیش مجھ کو نہ عیاش سمجھو — تم اس غم زدہ کو نہ بشاش سمجھو!

دیکھتے ہیں جو غمِ عشق میں بشاش مجھے — وہ مرے حوصلے پر کہتے ہیں شاباش مجھے

مگر یہ حوصلہ اُن میں سچ مچ موجود نہیں تھا۔ ظفر درحقیقت ایک کم زور دل و دماغ کے انسان تھے اور اتنا قوی اختیار اپنی طبیعت پر نہ رکھتے تھے کہ یہ آنسو ان میں بچ جاتے۔ بہ قول خود ؎

صبر مشکل ہی نہ کر صبر کا دعوا ہرگز — عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

عمر کے ساتھ یہ اختیار اور بھی اُٹھتا گیا اور کلام جس کا مقصود و منشا صرف دادِ تغزل دینا تھا، سراسر آپ بیتی بن گیا۔ یا تو یہ دعوا تھا کہ ؎

جو چاک ہو سینے کا اُسے ٹانک کے چھوڑوں — جس طرح بنے رازِ دلی ڈھانک کے چھوڑوں!

یا خود اعتراف ہی کہ ؎

ہو [illegible] کے کہ پی جاتے تھے اشک — اب تو چشمِ تر ظفر کچھ آبرو کھوتی چلی

کب تک کروں شکیب کہ دردِ فراق سے ہے فرق میرے صبر و تحمل میں آگیا

کہوں گر حال رسوائی ہے لیکن رہا جاتا نہیں مجھ سے ظفر چپ

ضبط کیا گریہ پر رک نہ سکا کیا کروں گر ہی پڑا اشکِ تر دیدۂ تر سے نکل

جس کشمکش کی ابتدا یہاں سے ہوئی تھی کہ "نہ کہنے میں مزا ہے منہ سے کہنا کچھ نہیں اچھا"

اس کی انتہا یہ ہوئی کہ یہ مزا بین و بیان میں آنے لگا ؎

بلا سے گرچہ ہوتا رازِ دل افشا ہے رونے میں

نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں!

پھر اس سے بھی گزر جاتے ہیں گویا اس لذت کو سہنے کی بھی اُن میں سکت

موجود نہ تھی۔ اب کہتے ہیں ؎

بہا گر آنسوؤں کا آنکھ سے دریا تو کیا حاصل

فرو کب اس سے میرے دل کی سوزش ہونے والی ہے

(نہ بدخواہوں سے کچھ ہوگا نہ ہوگا خیر خواہوں سے

جو کچھ تقدیر کی اپنی ہے گردش ہونے والی ہے)

مکرر :؎

نالہ کروں کیا سانس بھی لیتے اب تو جی ہے گھبراتا

چشم سے میں کچھ اشک بہا کر اپنے جی کو بہلاتا

چناں چہ اس کے بعد ایک مستقل بے حسی طاری رہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ظفر نے

بے حس ہی بن کر بانوے برس میں صبح زندگی کو شام کیا تھا ؎

نہ کبھی ہوں شاد شادی میں نہ غمگیں غم میں ہوں

میرا عالم اور ہی [illegible] اور ہی عالم میں ہوں

جو دل گرفتہ غنچۂ تصویر ہو میا پھر اس [illegible] ہنسئے کو [illegible] کیا ہنسے

کھلکھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے دل ہمارا خوش و خرم نہ ہوا پر نہ ہوا

نہ بزم غم سے غرض ہی نہ بزم شادی سے
جہاں میں کام ہی رونے سے شمع وار مجھے

خدا کرے کہ ظفر واں بنی رہے اپنی بلا سے بنتی ہماری یہاں نہیں نہ بنے

ای ظفر کچھ فکر کر واں کا کہ یاں تو چند روز
زندگانی ہی بہر صورت بسر ہو جائے گی

انھوں نے اپنے اوپر ایک شان استغنا طاری کر لی ہی۔ " ہی تو سب کچھ ہی میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں" جاہ و حشم بھی " ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو" اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہی کہ یہ بے نیازی طبعی نہ تھی بلکہ ایک عمر کی کش مکش کا نتیجہ تھی جس نے اکثر انھیں تڑپا دیا ہی۔ بہت سی خلشیں اور حسرتیں جنم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں خود کہتے ہیں ؎

تو نہ ہوتی تو عجب آرام تھا رکھتی بے چین آرزو تو ہی تو ہی

کھٹکنا خار غم کا چین اک دم بھر نہیں دیتا
نکالوں چیر کر دل پر کوئی نشتر نہیں دیتا

خوب ہوگا ہاں جو پہلو سے نکل جائے گا تو چین مجھ کو ای دل خانہ خراب آجائے گا

لے دل کو نکال آہ کوئی چیر کے پہلو شاید مجھے آرام ظفر ہوئے تو یوں ہو

بالآخر یہ کانٹا پہلو سے نکل گیا بہ قول انھی کے " مار کر ہم نے کیا اس دل بے تاب کو خاک"۔ اب وہ صرف تقدیر پر شاکر ہیں۔ ان کا توکل کسی حد تک ان کی مقدر پرستی کا پیدا کردہ بھی تھا جو اُن کے تمام کلام میں رچا ہوئی ہی اور اُن کی یاسیت کے اجزائے ترکیبی کا ایک اہم جزو ہی ؎

ذی خرد ذی ہوش ذی تدبیر پر شاکر ہیں ہم دوستو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم
ہی ظفر ہم سا جفاکش کون زیر آسماں ہر جفائے آسمان پیر پر شاکر ہیں ہم

فکر و تدبیر سے کیا ہوگا کہ جو ہونا ہے
ہو رہے گا تری قسمت سے ظفر آپ سے آپ

مہرۂ شطرنج ساں اپنی ظفر ہے کیا بساط
کرتا ہے وہ آپ بُرد و مات اپنے ہاتھ سے

جو کہ منظور اُسے ہے وہی ہوئے گا ظفر
کیا کروں میں کہ مرے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں

جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہوگا آخر کو وہی
اے ظفر کیا اس کا شکوہ یوں ہوا یا وُوں ہوا

قسمت ہی مخالف ہے فقط عشق میں میری
نے یار مخالف ہیں نہ اغیار مخالف

برگشتہ زمانہ ظفر ایسا ہوا ہم سے
جو یار موافق تھے وہ ہیں یار مخالف

جو ہونا ہے آخر وہ ہو کر رہے گا
کرے کون بخت آزمائی کا دھندا

لڑیں کیا زمانے سے کشتی کہ اس نے
پچھاڑے بہت پہلواں اچھے اچھے

اس قسم کے شعر اَن گنت ہیں۔ بے حوصلگی مقدر پرستی کے ساتھ لازم ہے۔ لیکن کسی قسم کی حوصلہ مندی اس وقت ظفر کے لیے نفسیاتی طور پر محال تھی۔ رفتہ رفتہ انھوں نے غم کو اصول زندگی بنالیا ہے

وہی جائے آخر کو خوش اس جہاں سے
جو غمگیں زیادہ رہے شاد کم ہو

زندگی کو وہ اس زاویے سے دیکھتے ہیں ؎

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ
اس بے مزگی پر کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے ادہیچ مداں ہیچ

اک عمر رہے بار دنیا سے گرانبار
آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں ہیچ (الخ)

ظفر زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ضرور رکھتے تھے جوان کے ابتدائی کلام کی رنگینی، قہقہوں اور چہلوں سے ظاہر ہے اور اگر سازگار حالات میسر ہوتے تو عجب نہ تھا کہ طبیعت پھر اسی شگفتگی کی طرف رجعت کر جاتی۔ وہ اپنے احوال سے بالکل مایوس ہیں مگر کبھی کبھی ایک موہوم سی لہر امید کی بھی نظر آتی ہے ؎

یہ ستارے کی ہے گردش اے ظفر گھبرا نہیں
دیکھنا تیرے بناتا کام ہے اللہ کیا

عقدۂ مقصود اپنے آج کل کھل جائیں گے
وہ جو بل کرتے ہیں ہم سے اُن کے بل کھل جائیں گے

جوں غنچہ عبث سر بہ گریباں ہے ظفر تو
کچھ فکر نہ کر دل میں کہ اللہ غنی ہے!

روز ہے تلخی غم اور روز ہے دل بے مزہ
دیکھیے کب تک یہ دن کڑوے کسیلے جائیں گے

انھی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت جھنجلاہٹ اور کھسیانے پن کی بھی ہے ؎

نہ پائے گا کوئی ہم کو بہ رنگ نقش قدم
ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملا دیں گے!

ترک شاہی کو کر اب طرز گدائی نہ لے کر
کوڑی کوڑی کا سب اسباب لٹاتے ہیں ہم

اُٹھے ہے جب شعلہ ہر فغاں سے تو جل کے نکلے ہے یہ زباں سے
الٰہی وہ بھی رہیں نہ ٹھنڈے جو ہیں ہمارے جلانے والے

جو کریں غارت کسی کو یاں دغا سے اے ظفر
اُن دغا بازوں کو خود ان کی دغا غارت کرے!

جل جل کے خاک ہوں گے وہ اے ظفر کہیں سب
ہیں شعلۂ شرارت جتنے اٹھانے والے

(بے شر تھے جو وہ ہمدم زیرِ زمیں گئے سب
قسمت کے رہ گئے ہیں فتنے اٹھانے والے)

اُن کے اندر انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے مگر شاذ ؎

ہر ایک سے لینا جہان کا بدلا
جنھوں نے رنگ مری عزّ و شان کا بدلا

تیری مرضی ہو تو لوں اُن سے الٰہی ٹیں بدلے
تیوری مجھ پہ ہیں جو لوگ بدلتے پھرتے

آگے پیچھے کے اشعار سے بھی بعض اوقات روش خیال پر روشنی پڑتی ہے۔ اس غزل کا لہجہ بھی محض عاشقانہ نہیں۔ مطلع ہے ؎

چھوڑ کر یار ہمیں سب ہوئے چلتے پھرتے
اپنی محرومی پہ ہم ہاتھ ہیں ملتے پھرتے

ظفر کو اپنی طویل مدت حیات میں بہت سے پرانے رفیقوں سے بچھڑنا پڑا ہوگا۔ انھیں جگہ جگہ یاد کیا ہے ؎

تھے یہاں اپنے قوی جن کے سہارے بازو
نظر آتے نہیں وہ ہائے ہمارے بازو

تھے جو رفیق و آشنا ڈھونڈیں انھیں ظفر کہاں
دے کے ہمیں ہزار ہا حسرت و غم چلے گئے

جو پہلے تھے یار اپنے اب ان کو کہاں ڈھونڈیں
باقی ہے نشاں کس کا ہم کس کا نشاں ڈھونڈیں

ہماری محبت کی تھی قدر جن کو
وہ سب اُٹھ گئے قدرداں اچھے اچھے

کہوں کس سے بے مہریاں اس فلک کی
کہ سب اُٹھ گئے مہرباں اچھے اچھے

کیا کیا تھے آشنا نہ رہا کوئی بھی ظفر
افسوس سب کے سب ہوئے بحرِ فنا میں غرق

ظفر ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

اسی طرح موجودہ وابستگانِ دولت سے دل برداشتگی بھی عین ان کی طبیعت کا مقتضا تھا۔ اس کی مثالیں پچھلے صفحات میں بھی نظر آئیں گی اور دیوان میں جابجا موجود ہیں ؎

آشنا ہیں جتنے ہیں اپنی غرض کے آشنا
خوب دیکھا ہم نے اپنا آشنا کوئی نہیں

ظفر امید وفا ایسے بے وفاؤں سے
گیا ہے وہم کدھر کس خیال میں تم ہو!

یوں تو ہیں آدم ہی آدم اس جہاں میں اے ظفر
پر جو دیکھا غور سے ہے کام کے آدم کا قحط

ظفر عجیب زمانہ ہے اور عجیب ہیں لوگ　　عجیب ان کی محبت ہے اور عجیب اخلاص

دم ناک میں ہمارا یہ لاتے ہیں بے ہنر
قسمت سے اے خدا کسی صاحب ہنر کو بھیج

ساتھ ہیں یوں تو ہزاروں اپنے دم کے آدمی　　پر نہیں ہمدم مٹانے والے غم کے آدمی

اب کہاں بندے خدا کے سچ جو پوچھو اے ظفر
اب تو بندے ہیں فقط دام و درم کے رہ گئے

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن　　ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

بعض جگہ طویل قطعے بھی اس مضمون کے ملتے ہیں جن میں ظفر نے خوب خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے ؎

مجھ سے تم کیا پوچھتے ہو۔ کیسے ہیں ہم کیا کہیں
جی ہی جانے ہے کہ جیسے مشفق من آپ ہیں

(ظاہر ہے کہ "مشفق من" کسی معشوق کا خطاب نہیں ہوسکتا)

بے مروت بے وفا نامہرباں ناآشنا　　میرے حاسد میرے قاتل میرے دشمن آپ ہیں
ظلم پیشہ ظلم شیوہ ظلم ران و ظلم دوست　　دشمنِ دل دشمنِ جاں دشمنِ تن آپ ہیں (الخ)

ظفر نے اپنی آنکھ سے کیا کیا شہر آشوبی نہ دیکھی ہوگی۔ ذیل کے اشعار اس کے شاہد ہیں ؎

پھر خواب میں بھی وہ نظر آیا نہ اے ظفر　　آنکھوں کے سامنے سے جو عالم نکل گیا

گیا کیا کیا گزر عالم ظفر آنکھوں کے آگے سے
کہیں کیا ہم نے جو یاں مثل چشم نقش پا دیکھا

عزیزو کام نہ کس کا یہاں بنا بگڑا
ہمارے پیشِ نظر اک جہاں بنا بگڑا

جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفرؔ

ہزار حیف وہاں آ شیانِ زاغ بنے

رفیقِ راہِ محبت کدھر گئے یارب کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا

کیا اور ہوگا اس سے زمانے کو انقلاب

جو بات عیب کی تھی ہنر ہوگئی تو ہے

پھر گئی اک بار ایسی باغِ عالم کی ہوا بولتے وہ بولیاں بھی جانور اگلی نہیں

ایک شہر آشوب میں کہتے ہیں ؎

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے

شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی رہتے بشریاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں

کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم بریاں تھے

ظفرؔ احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیش تریاں تھے

کیا عجب ہے کہ یہ عبرت کبھی تغلق آباد یا سیری وغیرہ کے کھنڈروں کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہو اور ظفرؔ کی طبعی افسردگی اور وقتی کوائف سے رنگ پاکر ان اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ایک اور شعر میں اسی مضمون کو ذرا اختصار کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

کتنے ہی بن کے شہر کے اور گانو کے نشاں

یوں مٹ گئے زمیں سے کہ جوں پانو کے نشاں!

ظفرؔ کی نفسی کیفیات کے اس تجزیے کو اس سے زیادہ طول دینا ممکن نہیں، چناں چہ ہم ابھی چند موٹے موٹے عنوانات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ظفرؔ کے ہاں ایسے

کلام کا بہت بڑا عنصر موجود ہی جو اُن کی شخصی زندگی سے بے حد قریب اور ان کی نفسیات کا آئینہ ہی۔ کلام کے حقیقت آفریں ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ شاعر اپنے نجی حالات، گھربار کے جھگڑے قصوں کا ذکر انھی ناموں سے کرے۔ روایاتِ سخن اکثر عنوان کی تبدیلی چاہتی ہیں اور بادہ وساغر کہے بغیر نہیں بنتی۔ قابلِ لحاظ نفسِ شعر اور وہ کیفیت ہی جس کا اظہار شاعر نے کیا ہو اور ایک ہی کیفیت کی طرف اس کا بار بار رجوع ہونا صریحًا معنی خیز بن جاتا ہی جس کی سند اس کی زندگی میں تلاش کی جاسکتی ہی۔ جس کلام کی بنیاد شگفتگی پر رکھی گئی ہو اُس میں اگر درد و یاس پیدا ہو جائے جو شاعر کی زندگی سے مطابقت بھی رکھتا ہو تو کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کلام اس کی خارجی زندگی سے متاثر ہی۔ چناں چہ تغزل کا پردا اُٹھا کر دیکھیے تو اس کی نفسیات کا پورا عکس دکھائی دے جائے گا۔ مگر واقعہ یہ ہی کہ ظفر کے ہاں تغزل کی یہ جھلملی بھی اکثر جگہ نہیں باقی رہنے پائی۔

ظفؔر کی یاسیت کے مرادفات افسردگی، پژمردگی، بے کیفی اور غم گینی ہیں۔ اس میں سوز و اثر موجود ہی مگر بلند تر المیے کی وہ شان نہیں پائی جاتی جس کے لیے ضروری ہی کہ سامع کو موضوع کے ساتھ کوئی گہرا اخلاقی یا جذباتی لگاؤ ہو۔ یہ میری اور آپ کی فطرت کے رموز و حقائق یا کربلا کا سانحہ نہیں بلکہ ایک شخص کی خالص نجی اور ذاتی واردات، اس کی خلشوں، حسرتوں، مجبوریوں اور کم زوریوں کا افسانہ ہی جس کی تاثیر، کلام کی بعض فنی خصوصیات کے علاوہ کچھ اس امر اتفاقی پر بھی مبنی ہی کہ وہ شخص تاریخی اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت ضرور رکھتا تھا وعلیٰ ہذا القیاس، وہ لوگ اس افسانے سے متاثر ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں جو ظفر کے ساتھ کسی قسم کا جذباتی لگاؤ بھی محسوس کرتے ہوں۔

اب تک اس بحث کا تعلق ظفر کے چار مطبوعہ دیوانوں سے رہا ہی جو ان کی زندگی ہی میں طبع ہو چکے تھے۔ لیکن یہ امر تحقیق طلب نہیں کہ ظفر نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنی مشقِ سخن جاری رکھی گو یہ کلام باضابطہ اور مستند طور پر آج تک شائع نہیں ہو سکا نہ یہ معلوم ہی کہ کس ذریعے سے عوام تک پہنچا۔ ایک روایت ہی کہ وہ اپنے ملاقاتیوں کو اپنا کلام تحفۃً پیش کرتے تھے اور اس پر حکومت کی طرف سے ان کی زندگی میں کوئی پابندی نہ تھی چناں چہ اس طرح سینہ بہ سینہ جو کلام لوگوں تک پہنچا، اس نے کافی شہرت پائی اور آج تک مقبول ہی۔ یہ کلام کچھ بزرگوں کو یاد ہی، کچھ قوالوں کی مشق میں ہی لیکن چوک پر بکنے والے بعض ٹکیل مجموعوں میں نہایت مسخ شدہ شکل میں نظر آتا ہی۔

سُنا تھا کہ ایک بار جسٹس سید محمود مرحوم کو کسی انگریز سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کے پاس ظفر کا کلام زمانۂ رنگون کا کہا ہوا موجود تھا۔ سید صاحب نے اُس پر ایک نظر ڈالی اور بہت کچھ زبانی یاد رہ گیا۔ اس روایت کے متعلق سر راس مسعود مرحوم اپنے ایک خط میں (جو ہمارے پاس محفوظ ہی) لکھتے ہیں کہ "میرے والد کو بہادر شاہ مرحوم کا وہ تمام کلام خود یاد تھا جو انھوں نے رنگون کے زمانۂ قیام میں کہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے والد کو اُن مصائب کے ساتھ بے حد ہمدردی تھی جو مغلوں کے آخری بادشاہ کو اٹھانا پڑیں"۔

ظاہر ہی کہ سید محمود مرحوم کے لیے وہ تمام کلام بارِ دماغ نہ ہوگا اور ظفر نے رنگون میں بھی ایسے شعر کہے ہیں کہ صاحبِ ذوق انھیں اپنے ذہن میں محفوظ کرے۔

بعض اوقات ظفر کے قیامِ رنگون کے کلام کے متعلق یہ کہا جاتا ہی کہ یہ فنّی اعتبار سے کسی قدر پھسپھسا اور ناقص ہی لیکن یہ اعتراض اس قسم کے تمام

کلام پر وارد نہیں ہوتا اور جس قسم کی فنی یا عروضی لغزشیں بعض خارج از دیوان اشعار میں نظر آتی ہیں، وہ دیوان میں بھی استادوں کی اصلاح کے باوجود اکثر جگہ موجود ہیں۔ یوں بھی لغزشیں چنداں لائق گرفت نہیں۔ ایسے جاں گداز صدمات کے عالم میں بڑے بڑے فن کاروں کے ہاتھ لغزش کھا گئے ہیں اور عین اضطراب کے عالم میں تو صناعی ممکن ہی نہیں جب تک کہ شاعر اتنی زبردست ذہنی قوت نہ رکھتا ہو کہ اپنے الم و اضطراب پر توجہ کو مرکوز رکھتے ہوئے بھی انھیں اپنے قلم پر اثر انداز نہ ہونے دے۔ چار بیسی سے اوپر کے ایک کنگ لیئر" سے اس ذہنی توازن کی کیا توقع ہوسکتی تھی۔ ظفر کا یہ کلام اس کے درد مندول کی پکاریں ہیں جو فنی کمزوریوں کے باوجود سوز و اثر سے خالی نہیں ؎

"گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے"

یہاں نظم کے مجموعی اثر سے انحراف کر کے تعقید لفظی کی گرفت کرنا بجائے خود ایک بدمذاقی ہوگی ع

وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

مصرع ذرا سے تامل سے زیادہ چست ہوسکتا تھا مگر نہیں ہوسکا۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ شہر کے عوام نے جن کی پر خلوص اور نیاز مند فطرت نے ان الم ناک سانحات کا زیادہ گہرا اثر قبول کیا تھا، اپنی ارادت کے جوش میں بہت سے ٹوٹے پھوٹے مرثیے کہے جن میں کہیں ظفر کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہیں محض اس کا نام لے لے کر آنسو بہائے ہیں۔ بعض درد مندوں نے ظفر کی زمین میں شعر کہہ کر گویا ان افسانوں کو مکمل کرنے کی کوشش بھی کی ہے جو اس نے اپنی نظموں میں چھیڑے تھے۔ اس طرح ظفر کا کلام بہت خلط ملط اور نامعتبر صورت میں ملتا ہے۔ لہٰذا اس کو اس بحث میں شامل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔ تاہم بعض کلام

ایسا موجود ہے جس پر کوئی معقول شبہہ وارد نہیں ہوتا اور جو اپنے انداز و قرائن کی داخلی شہادت سے بہ موجب بلا شبہہ ظفر ہی کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی کوئی خاص اعتراض وارد نہ ہو تو کثرتِ شہرت اور زبانِ خلق کو اس معاملے میں کافی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کلام میں ایک غزل یہ ہے ؎

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مرے پاس آئے تھے دم بہ دم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے

جو ملاتے تھے نہ نخوت سے نظر (کبھی) اپنے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ اٹھی یہ تھا وہ سبھی غروروں کو ڈھا گئے

بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت ان کی گلے پڑی
وہ جو کاکلیں تھیں بڑی بڑی وہ اٹھی کے پیچ میں آ گئے

یہ غزل ان کی بہت مشہور اور نہایت پر اثر ہے۔ سوز اور ترنم آفرینی کے اعتبار سے اس جوڑ کی مسلسل غزلیں اُردو میں کم نکلیں گی۔ (تغزل سے قطع نظر کر کے دیکھیے اور رنگون یا دلّی کے زندان خانے میں ایک خانہ خراب بڈھا تغزل کی کیا صلاحیت رکھتا ہو گا!) تو غزل خود گواہی دے گی کہ اس وقت ظفر کے پیشِ نظر کوئی خیالی یا فرضی شاہد نہیں بلکہ ان کی آنکھیں قلعے ہی کے اصنامِ شکستہ پر جمی ہوئی ہیں۔ بن سنور کر آنے اور بہارِ حسن دکھانے والے رجواب" دل کو داغ لگا کر" رخصت ہو چکے اور جن کی "حسرت گلے پڑی" اُس کے اپنے چشم و چراغ اور اس کی اپنی گم شدہ

جنت کے حور و غلمان تھے، جن کی یاد میں ظفر نے یہ اشک حسرت بہائے ہیں۔ چناں چہ یہ غزل اُردو کے نہایت پرتاثیر مرثیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے اور یقین نہیں آتا کہ دلّی کے کسی گلیارے میں کسی شاعر نے کہہ دی ہوگی۔

ظفر کا انداز کلام

ظفر کے انداز کلام کی خصوصیات پر پچھلے صفحوں میں بھی کچھ روشنی پڑ چکی ہے۔ تاہم یہاں ان پر ایک اجمالی تبصرہ بے محل نہ ہوگا۔ ظفر کے کلام کی نمایاں خصوصیات، سادگی، بے تکلفی، فصاحت اور محاورہ بندی وغیرہ ہیں۔ پھر بھی ان الفاظ سے ظفر کے رنگ سخن کی پوری پوری تعریف و تشریح نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ہر خصوصیت اُردو شاعری میں بہت ارزاں ہے لیکن ان کے مجموعے سے ظفر کے ہاں جو رنگ پیدا ہوا ہے وہ اس قدر منفرد اور بے مثال ہے کہ ناظر کی سرسری نظر سے بھی اس کی انفرادیت نہیں چوک سکتی ؎

نہ ہم خوش نہ خفا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو
غرض کیا کام کیا دل سے کوئی یوں رہا ہو تو یوں بھی ہو

زباں میں ہو اثر تیری تو شاید دل پھرے اُس سے
اگر ناصح دعا دل سے کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو

ظفر انوکھی زمینوں کے شائق ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

دل اپنا فکر سخن میں ظفر نہیں لگتا — زمیں غزل کی نہ ہو جب تلک انوکھی سی

اور اس انوکھی زمین میں "کوئی یوں ہو تو یوں بھی ہو" کی بے ساختہ تکرار کے ساتھ اپنے جملہ مطالب کو ادا کرتے چلے جانا مگر اس طرح کہ فصاحت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور کلام کی بے تکلفانہ سادگی و سلاست میں فرق نہ آئے۔ یہی ظفر کے کلام کی خصوصیت ہے اور اس رنگ کے وہ بادشاہ ہیں۔ ظفر کی کسی زمین میں بھی

کوئی نیا تیور یا ردیف کی کوئی نئی نشست اختراع کرنا اور کسی شعر کی فصاحت یا سلاست میں اضافہ کرنا دونوں محال ہیں۔ گویا یہ سہل ممتنع بھی ہے اور "اشعار ممتنع" بھی! ظفر کے کلام کی سادگی اور بے تکلفی کی مثال میں اوّل سے آخر تک ان کا سارا دیوان پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر قسم کے مطالب کو، تصوف و اخلاق ہو یا واردات اور تغزل، انھوں نے اسی خصوصیت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ وہ حتی الامکان گراں فارسی الفاظ اور ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں اور خالص ہندستانی زبان میں شعر کہتے ہیں جس میں قلعہ معلیٰ کی فصاحت اور محاورہ بندی شامل ہے۔ شستگی زبان اور محاورات کے بے ساختہ استعمال میں شاید ہی کوئی ظفر کا ہم پلہ ہو۔ ان کی فصاحت کی خوبی یہ ہے کہ محاورات کو چن چن کر دکھانا ممکن نہیں۔ یہ شعر میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے نہیں بلکہ مٹھاس کی طرح گھلے ہوئے ہوتے ہیں ؎

کیا کیا نہ کیا اور ہیں کیا کچھ نہیں کرتے
کچھ کرتے ہیں ایسا بخدا کچھ نہیں کرتے!

کیا ہی ہما ہمی ہے بتوں کو بھی اے ظفر
کہتے ہیں یہ جہاں میں ہمیں ہوں کوئی نہ ہو!

کھلی ہے جس پر کہ کچھ حقیقت وہ کھول کر دیدۂ بصیرت
تماشے قدرت کے دیکھتا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

دل غم الفت سے مضطر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
چشم آب گریہ سے تر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

تم جو کہتے ہو ظفر کو کچھ نہیں یہ آدمی
خیر بہتر بندہ پرور کچھ نہیں تو کچھ نہیں

کچھ ان کے دیکھتے ہی اپنی حالت ایسی ہوتی ہے
کہ سب کہتے ہیں توبہ ہائے چاہت ایسی ہوتی ہے!

مرے رونے پہ کیوں ہنستے ہو صاحب خوف کی جا ہے
مقدر کا نہیں مٹتا ہے لکھا بندہ عاجز ہے!

محاورہ بندی کا حق اور شاعروں نے بھی ادا کیا ہے مگر وہ بے تکلفانہ سادگی جو ظفر کے کلام کی جان وجوہر ہے کسی کے ہاں اس فراوانی سے نہیں ملتی۔ اس کے آگے ناقد کی نظر انتخاب خیرہ ہو کر رہ جاتی ہے ؎

بستے تھے وہ جو لوگ یہاں، کوئی بھی نہیں
سونے پڑے ہیں اُن کے مکاں، کوئی بھی نہیں
میں دل کو جانتا تھا بڑا دوست عشق میں
دیکھا تو ایسا دشمن جاں، کوئی بھی نہیں

دل طلب کر کے ہوے وہ طالب ایمان و دیں
ایک مطلب میں کئی مطلب نظر آنے لگے
پردۂ غفلت میں ہے کیا جانے کیا کیا ہو رہا
آنکھ سے پردہ اُٹھے تو سب نظر آنے لگے

ظفر اُس نے کہی تھی بات کچھ ہم سے سو وہ ہرگز
نہیں آتی زباں پر اور ہمارے دل میں پھرتی ہے!

جانا کہاں ہے تم کو ذرا دھیان تو کرو — بار و سفر کا کچھ سر و سامان تو کرو
ہم سے بیاں تم اپنا وہ ارمان تو کرو — ارماں کیا ہے حضرت دل جی میں آپ کے

نہ دوں گا دل کبھی اس کو یہ روز کہتا تھا
وہ آج لے بھی گیا اور ظفر سے کچھ نہ ہوا!

یہ ماجرائے دیدۂ نم ہم سے پوچھ لو — ہم جانتے ہیں جس لیے روتے ہو تم ظفر

حضرتِ دل ہمیں کچھ کام نہیں تم جانو — جاؤ اس بن اگر آرام نہیں تم جانو
اور اگر یہ ہے تو اسلام نہیں تم جانو — تم مسلماں ہو ظفر خوب نہیں عشق بتاں

چپ رہو کوئی دم خدا کے لیے — نہ بھرو دم بدم ظفر آہیں

ہو گئے پرسوں کے برسوں تم نہ آئے کیا سبب

آپ نے اچھا کیا وعدہ وفا، اچھے تو ہو!

نہ پوچھو دوستوں کی اپنے حالت اپنی فرقت میں

کہ جس کو دیکھ کر دشمن کو بھی رحم آئے ایسی ہو!

بوسہ مانگا تو کہا بس چلو یاں سے نکلو — منھ لگایا تمھیں کیا تم تو ظفر چل نکلے

ساتھ رکھو ہمیں جھگڑے نہ بچو — کہیں اس پھرنے میں پڑے نہ بچو

سہل ممتنع کی مثالیں دیکھیے ؎

بے راہ تما تنہا جائیں تو کدھر جائیں — معلوم نہیں رستا جائیں تو کدھر جائیں

دنیا کی ظفر آگر ہم بھول بھلیوں میں — ہیں بھول گئے رستا جائیں تو کدھر جائیں

آؤ گھر میں مرے صنم آؤ — تمھیں اللہ کی قسم آؤ

قاصدو لاؤ جلد خط کا جواب — ایک دم جاؤ ایک دم آؤ

صنما ہم کہیں تو کیا کہویں — بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں

کہیں تجھ سے جو ہو مزے کی بات — بے مزا ہم کہیں تو کیا کہویں

مدعی کہنے ہی نہیں دیتے — مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں

جاؤ تنہا نہ تم تمھارے ساتھ — جائے گی میری جاں کھڑے تو رہو

ہو پڑی دل جلوں کی آہ جہاں — تاب کیا تم وہاں کھڑے تو رہو

قد پہ نازاں ہے اپنے سروِ چمن — اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو رہو

ردیف میں جو لفظ یا ترکیب استعمال کی ہے، اس کی پوری لغت قلم بند کر گئے ہیں ؎

ہوا غم غم گساری کے موافق — یہ نکلا یار یاری کے موافق

قفس سے اڑ کے ہم صحنِ چمن میں — گئے بادِ بہاری کے موافق

سپند و شعلہ و سیماب کب ہوں
ہماری بے قراری کے موافق
محبت میں یہ بے ہوشی بھی اپنی
ظفر ہے ہوشیاری کے موافق

ایک اور دلچسپ طرح ہے ؎

نہ کیجیے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق
وگرنہ ہووے گی پھر دو بدو تڑاق پڑاق
الٰہی محتسب سنگ دل کے ٹوٹیں ہاتھ
کہ توڑتا ہے یہ جام و سبو تڑاق پڑاق
وہ دینے پائے نہ گالی کہ لے لیے ہم نے
ہزار بوسۂ رو سے نکو تڑاق پڑاق
ظفر مزاج جو شوخی پسند ہے اپنا
تو چاہتا ہے کوئی خوب رو تڑاق پڑاق
(زود گالی بذا الفطاس)

سلاست، فصاحت اور محاورہ بندی کے علاوہ ظفر کلام میں لطافت اور تاثیر پیدا کرنے کے دوسرے اسالیب کا استعمال بھی خوب جانتے تھے۔ ان کے اشعار کا صوتی اثر بالعموم بہت خوش آیند ہوتا ہے۔ انھیں لطیف ترکیبوں اور تیوروں کے استعمال اور انتخاب الفاظ کا خوب سلیقہ تھا ؎

جوں بوئے گل فیت نسیم چمن ہیں ہم
اے ہم دمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
ہیں گرچہ مثل شمع سراپا زباں تو کیا
کہہ سکتے پر زباں سے نہیں اک سخن ہیں ہم

ظفر دنیا سے فانی خواب کا سا ایک عالم ہے
مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیے

چپکے سے مرا خط انھیں دے دیجیو قاصد
کچھ منھ سے خبردار خبردار نہ کہنا!

کہوں کیا جوش اشکوں کا معاذ اللہ معاذ اللہ!
امنڈ آیا ہے اک دریا معاذ اللہ معاذ اللہ!

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا!

ظفر بالعموم طویل بحریں استعمال کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی ہے کہ وہ اپنا مطلب

وضاحت وتشریح کے ساتھ زیادہ اچھی طرح ادا کر سکتے تھے۔ ایجاز و اختصار ان کے ہاں بہت کم ملتا ہے۔ بعض جگہ تو پورے مصرعے کے برابر ردیف استعمال کی ہے ؎

ہوئی جس سبب تم سے ہم سے جدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بیاں یہ تو کردے گی ساری خدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بلا سے کوئی گر برا یا بھلا ہے ہمیں کام کیا اور تمہیں کام کیا ہے
ظفر اب کسی کی برائی بھلائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

پیچھے کہا جا چکا ہے کہ ظفر کے کلام کی طرح شگفتہ شاعری پر رکھی گئی تھی۔ چناں چہ افسردگی و پژمردگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں شگفتگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اکثر جگہ نہایت بشاش شعر کہے ہیں۔ خصوصاً ان کی یہ غزل شگفتگی کی جان ہے ؎

کہوں کیا رنگ اس گل کا اہا ہاہا اہا ہاہا ہوا رنگیں چمن سارا اہا ہاہا اہا ہاہا

اس سلسلے میں چند اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

عجب روش سے انھیں ہم گلے لگا کے ہنسے کہ گل تمام گلستاں میں کھلکھلا کے ہنسے
نشے میں آج ساقی نے جو مستوں کو اڑا مارا
لب ساغر پہ منہ شیشے نے دھر کر قہقہہ مارا
جب کھلکھلا کے ساقئ گلفام ہنس پڑا شیشے نے قہقہے لیے اور جام ہنس پڑا
تھا غنچہ دل گرفتہ نہایت چمن میں آج پر کچھ دیا صبا نے جو پیغام ہنس پڑا

الغرض گریہ وزاری کے ساتھ قہقہے بھی کلام میں ملتے ہیں۔ ظفر کے ہاں ظرافت یا خوش طبعی بھی موجود ہے۔ اور بعض جگہ بہت لطیف ہوتی ہے ؎

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہے مزا
محفل میں ذکر بادہ و ساغر کہے بغیر

قباحت زاہد و کیا ہی بتو کو سجدہ کرنے میں
جو ہر شے میں اُسے شامل سمجھتے ہو تو کر بیٹھو!

ظالم جو تو نہ ہووے مکدر تو جھاڑ دوں
سر پر عدو کے گرد و غبار اپنے ہاتھ کا

جو اس عینک میں سوجھے ہی وہ پوچھو می پرستوں سے
کہ جب تم نے چڑھائے بھر کے دو پیمانے کیا سوجھی؟

جا بیٹھا عبث شہر سے ویرانے میں زاہد
کیا سوجھے گا جنگل میں جو بستی میں نہ سوجھا!

انداز کلام کے مذکورہ محاسن کے ساتھ ساتھ ظفر کا کلام عوائب و علل سے بھی پاک نہیں۔ نحیف بندش اور بے جا تعقید کی مثالیں کافی ارزاں ہیں ؎

جفا کی آپ کی باعث وفا ہماری ہی
خطا تمھاری نہیں ہی خطا ہماری ہی

نظر کیوں ہم سے اپنی کرکے وہ چھلبل چراتے ہیں
کہ زیرِ تیغ دم کب ہم سرِ مقتل چراتے ہیں

ہوگئے ہیں ساتھ جو تیرے یہیں تک ہیں وہ ساتھ
آیا یاں تنہا ہی تو تنہا ہی غافل جائے گا

فارسی الفاظ سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں مگر سادگی کے شوق میں اکثر بہت بھونڈے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن سے شعر کی لطافت زائل ہو جاتی ہی۔ بعض جگہ ہندی الفاظ کے ساتھ اضافت بھی استعمال کر گئے ہیں (مگر اتنے سلیقے سے نہیں کہ سند بن سکتی) اور بہت فحش عروضی غلطیاں کی ہیں ؎

دیا نہ یار نے بوسہ ہمیں جو بے تکرار
ظفرؔ نہ دل بھی اُسے ہم نے بے جھمیل دیا

دیکھ روتے جو مجھے آیا ظفرؔ رحم اُسے
ہنس کے وہ میرے گلے زور بھینچ لپٹا

میں وہ ہوں سوختہ جاں ان بتِ گم راہوں کا
جس کا پہنچے ہی دھنوا عرش تلک آہوں کا

اس لیے مجھ کو خیالات گلستاں ہو گا داغ دل بھی مرا رکھتا ہو چمن سے بنگ
متاسف کوہ کن کے بار کوہ غم اٹھانے پر
پٹکتا تھا جو سر شیریں کے سنگِ آستانے پر

اسی طرح رعایت لفظی کے شوق میں بعض اوقات فصاحت کا خون کر جاتے ہیں ؎

دل سے لینے کو چٹکیاں میرے تم نکالو نہ چٹکلے بیٹھے !
نہ بھیجا تم نے لکھ کر ایک پرچہ ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
نہ بولا ہم نے کھڑکایا بہت دیر ذرا دربان کو کھڑکایا تو ہوتا

گو اپنی کٹھن زمینوں کو وہ عموماً کامیابی سے نبھاتے ہیں مگر ان کی یہ دشوار پسندی اکثر جگہ آورد بھی پیدا کر دیتی ہو اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مضمون ہوتا ہی ؎

چبھی مژہ کی جو لختِ دل خراب میں سیخ
دکھائی دی وہ پروئی ہوئی کباب میں سیخ
کباب واسطے اس خوش دماغ کے نہ لگائے
نہ دھولے پہلے کبابی اگر گلاب میں سیخ
لکھے ہو مجھ کو جو مجنوں اجاڑیں سے خط تو کوہ کن بھی لکھے ہو پہاڑیں سے خط!

اس قسم کا گھاس پھونس بھی بہت ملتا ہو۔ کہیں کہیں شوخی سے گزر کر رکاکت پر بھی آگئے ہیں اور غزل خاصی ہزل بن گئی ہو۔ اس کی مثالیں حذف کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ظفر کے ہاں ندرتِ تفکر اور تازگیٔ مضمون بہت کم ہو۔ عاشقانہ کلام میں جو ان کی شاعری کا سب سے بڑا جزو ہو ان کے اکثر خیالات فرسودہ اور جذبات مصنوعی ہیں۔ اتنا ضرور ہو کہ وہ اپنے مخصوص

انداز بیان سے مضمون کو دل چسپ بنا دیتے ہیں اور شعر باوجود فرسودگیٔ مضمون کے شگفتہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح ان کے وارداتی کلام میں اکثر جگہ آب محض اُن کے آنسوؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ بہ قول اُن کے اُستاد کے ؎

"چھڑک کر بیچتا ہوں نفع پر سودا خسارے کا!"

بہر حال ظفر کے گوناگوں محاسن کلام کے پیشِ نظر عیوب و اسقام سے چشم پوشی عین انصاف ہے۔ ظفر ان معائب کے باوجود شاعر تھا اور کامیاب شاعر تھا۔ زبان اور اظہارِ مطالب پر اسے بے مثال قدرت حاصل تھی اور اپنا مخصوص اندازِ کلام رکھتا تھا جو بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ اُس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا خلوص ہے۔ یہ بالعموم اس کی زندگی سے ہم آہنگ اور اس کے شخصی خصائل کا آئینہ دار ہے۔ ظفر بادشاہ تھا، صوفی تھا، شاعر تھا، اہلِ زبان تھا، پاک باز تھا اور دردمند تھا۔ چناں چہ اس کے کلام میں اس کی شخصیت کے یہ تمام پہلو نمایاں ہیں۔

اُردو زبان کو ظفر کی ذات سے جو فیض پہنچا، وہ اُردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ظفر دلّی کی بزمِ آخر کا چشم و چراغ اور زبان و ادب کا مربّی و سرپرست تھا۔ اُردو اس کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ؎

زمانے میں جو کہلاتے ہیں شاعر آج کل اچھے
ظفرؔ رتبہ ملا اُن کو ترے فیضِ سخن سے ہے!

(شان الحق حقّی)

انتخابِ ظفر

(بہت سے اشعار جو مقدمے میں شامل ہیں انتخاب سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ لہذا مقدمے کو بھی انتخاب کا جزو سمجھنا مناسب ہو گا)

دیوانِ اوّل

ہاں فروِ سوزِ دل اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا
اور گریے سے بڑھا کم نہ ہوا پر نہ ہوا

سن کے نالوں کو مرے ہو گئے پتھر پانی
سرِ مژگاں ہی ترا نم نہ ہوا پر نہ ہوا

ہوں وہ آزاد کہ جوں سرو کسی کی خاطر
قدِ تعظیم مرا خم نہ ہوا پر نہ ہوا

اے ظفر دیکھیے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا
چین دنیا میں تو اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا

زلف میں بل اور کاکل پر خم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
وہ ہوئی سرکش یہ ہوئی برہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

دل تو کمندِ غم میں پھنسا ہے جان اسیرِ دامِ بلا ہے
عشق کے ہاتھوں ناک میں ہے دم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

پیچ سے ہے وہ کرتا یاری باتیں اس کی پیچ کی ساری
نکلیں اس کے پیچ سے کیا ہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

عشق ظفر ہے گورکھ دھندا کھولے اس کے پیچ کوئی کیا
ایک کھلا تو دوسرا محکم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

غمِ دل کس سے کہوں کوئی بھی غم خوار نہیں
غمِ فرقت کے سوا

اور اگر پوچھے کوئی لائقِ اظہار نہیں
چپکا رہنا ہے بھلا

سینکڑوں ہیں جگر افگار ہزاروں دل ریش   ترے ہاتھوں لیکن
پاس تیرے کوئی خنجر کوئی تلوار نہیں   ہاں مگر ناز و ادا

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اُٹھ گیا   ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اُٹھ گیا
ای ظفر کیا پوچھتا ہی بے گناہ و بر گناہ   اٹھ گیا اب تو جدھر کو دست قاتل اُٹھ گیا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیے نے تاج شاہانہ   مجھے تو ہوش رے اتنا کہ ہوں میں تجھ پہ دیوانہ
نہ دیکھا وہ کہیں جلوہ جو دیکھا خانۂ دل میں   بہت مسجد میں سر مارا بہت سا ڈھونڈا بت خانہ
کچھ ایسا ہو کہ جس سے منزل مقصود کو پہنچوں   طریق پارسائی ہو کہ ہووے راہ رندانہ
ظفر وہ زاہد بے درد کی ہو حق سے بہتر ہی   کرے جو رند درد دل سے ہاؤ ہوئے رندانہ

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں یہ جو دل پہ رنج و ملال ہی
وہ جب آ گئے مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا
ظفر اس سے چھٹ کے جو حسرت کی تو یہ جانا ہم نے کہ دام تھی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے مٹا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دَورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
اُسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب ہزار فسوں، نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ رہِ میخانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

ہر نفس اُس دامنِ مژگاں کی جنبش سے ظفرؔ
دل میں ایک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

خدا جانے حلاوت کیا تھی آبِ تیغِ قاتل میں
لبِ ہر زخم ہے گویا اہا ہاہا ہا ہا ہا
شرار و برق میں کیا فرق سمجھوں میں کہ دونوں میں
ہے اک شعلہ بھبوکا سا اہا ہاہا ہا ہا ہا
مری صورت پرستی حق پرستی ہے کہوں میں کیا
کہ اُس صورت میں ہے کیا کیا اہا ہا ہاہا ہاہا

ظفر میں کیا کہوں عالم طبیعت کی روانی کا
ہر اک اُمڈا ہوا دریا اہا ہاہا ہا ہاہا

مری جانب سے غیروں نے لگایا کچھ نہ کچھ ہوگا
نہ آیا وہ تو اُس کے جی میں آیا کچھ نہ کچھ ہوگا

نہ ڈھونڈا اور نہ پایا ہم نے کچھ اس بحرِ ہستی میں
وگرنہ جس نے ڈھونڈا اس نے پایا کچھ نہ کچھ ہوگا

سنا میں نے کٹی اُن کو بھی ساری رات آنکھوں میں
کسی نے میرا افسانہ سنایا کچھ نہ کچھ ہوگا

شعلۂ حسن تو اوروں کو دکھا کے مارا
تو نے ظالم ہمیں بے آگ جلا کے مارا

سوتے تھے چین سے ہم خوابِ عدم میں لیکن
شورِ ہستی نے ہمیں آہ جگا کے مارا

چین سے گھر میں پڑے کرتے تھے باتیں دل سے
وحشتِ عشق نے دے ہم کو اٹھا کے مارا

نالہ بھی کرنے نہ پائے کہ نکلتی حسرت
ہم کو اے عشق گلا تو نے دبا کے مارا

آنکھ چاہت کی ظفر کوئی بھلا چھپتی ہے
اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

کچھ قدر مری تو نے ستم کار نہ جانی
چھاتی سے لگاتا جو کوئی اور سا ہوتا

قسم خدا کی تجھے قاصدا کہ یہ پیغام
کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا؟

نہ ہرگز دردِ دل سے میں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نبھاہا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے تو پوچھو لذتِ عشق
اہا ہاہا، اہا ہاہا، اہا ہا!

ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا، کرم گارا، الٰہا!

گور گنج فراغ ہی اپنا — داغ اپنا چراغ ہی اپنا
کون ہی کنج حزن میں دم ساز — ایک دل سوز داغ ہی اپنا
ڈھونڈتا ہی خدا کو تو زاہد — ہم کو قصد سراغ ہی اپنا
جب سے اس مہ جبیں کے عاشق ہیں — آسماں پر دماغ ہی اپنا
ای ظفر کیجیے سیر وسعت دل — کہ یہی باغ وراغ ہی اپنا

ہوں میں وہ سنگ کہ دہقان فلک نے مجھ کو — گردش دہر کی گوپھن میں پھرا کر پھینکا

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں — ہم نے تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

جب کھلکھلا کے ساقی رنگیں غام ہنس پڑا — شیشے نے قہقہے لیے اور جام ہنس پڑا
سیراب آب تیغ سے ہو کر برنگ گل — ہر ایک زخم عاشق ناکام ہنس پڑا
کیا بات یاد آگئی اس کو کہ ای ظفر — وہ یک بیک جو سن کے مرا نام ہنس پڑا

وہ نہ آیا یار لائے ، یوں نہ تھا تو یوں ہوا — اُن کا آنا بن بلائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا
دے کے اُس بے درد کو دل ہوں ظفر میں دردمند — واہ دُکھ بیٹھے بٹھائے یوں نہ تھا تو یوں ہوا

دیا ہی جس نے وہاں تک خیال کو پہنچا — مرے خیال میں ہی وہ کمال کو پہنچا
تجھے بھی رنج جو پہنچا کسی سے خوب ہوا — اذیت اور دل پر ملال کو پہنچا

کرتے تھے اخلاق دل لینے کو سو دل لے چکے — کیا بتاؤں تیں کہ ان کا پیار کیا تھا کیا ہوا
ہو گیا جو کچھ کہ ہونا تھا مری تقدیر میں — کیا بتاؤں میں کہ ای غم خوار کیا تھا کیا ہوا

سرکشی کرتا ہے کیا کیا اپنی ہستی پر حباب — دیکھنا اک دم میں یہ پندار کیا تھا کیا ہوا
لے گیا وہ نیم غمزے میں جو دل کو اے ظفر — ہو گیا حیران میں یک بار کیا تھا کیا ہوا

کیا کہوں دل مائل زلفِ دوتا کیوں کر ہوا — تھا بھلا چنگا گرفتار بلا کیوں کر ہوا
جو نہ ہوتا تھا ہوا ہم پر تمہارے عشق میں — تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیوں کر ہوا

وہ تو ہے ناآشنا مشہور عالم میں ظفر
پر خدا جانے وہ تجھ سے آشنا کیوں کر ہوا

روئے جو دل کھول کر ٹکڑے جگر ہونے لگا — اور اگر رونے کو روکا درد سر ہونے لگا
کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے — دل سے میں مجھ سے مرا دل بے خبر ہونے لگا

مت اُٹھا آسودگانِ خاک کو اے روزِ حشر — اک ذرا راحت ہوئی ہے ان کو مر مر کر نصیب

فاقہ مستی کے مزے پوچھے کوئی مفلس سے — پیتے اس لطف سے ہیں کاہے کو زردار شراب

بے سبب چرخ ہے اک بر سرِ کیں آپ سے آپ — سر پھرا اور کسی کا تو نہیں آپ سے آپ
کیسی تدبیر ظفر جب وہ کرے اپنا کرم — کام بگڑے ہوئے بن جائیں یونہیں آپ سے آپ

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ — اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچ مداں ہیچ
اک عمر ہے مایہ دنیا سے گراں بار — آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں ہیچ

پیری میں گر حلاوتِ غفلت زیادہ ہو — یارو عجب نہ سمجھو کہ شیریں ہی خوابِ صبح

چرخ فانوس خیالی اور ہم حسرت زدہ — کھارہے ہیں اس میں کیا کیا صورتِ تصویر چرخ

خارِ صحرا نے جنوں یوں ہی اگر تیز رہے — کوئی آنے کا نہیں آبلہ پا میرے بعد

اس ستم گر نے مجھے جرمِ وفا پر مارا — کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

اے ظفر کیوں کہ محبت کو نہ ہو غم میرا — کوئی غمخوارِ محبت نہ ہوا میرے بعد

رفعتِ جاہ پہ بھی گردشِ طالع نہ گئی — کھاتے ہیں روز فلک پر مہ و اختر چکر

جو عرش سے ہی فرش تلک آدمی میر ہی — دیکھ آنکھ کھول کر

کیا کیا نہیں ہو اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہو — پر چاہیے نظر

دل اپنا پہلے زنگ کدورت سے صاف کر — مانندِ آئینہ

پھر تو یہ غور دیکھ کہ اس آرسی میں کیا ہو — کیا حسن جلوہ گر

پیدا نگاہ کر کہ تجلیٔ حسنِ یار — ہر جا ہو آشکار

شعلے سے طور کے نہیں کم روشنی میں ہو — ہر سنگ کا شرر

کیوں کعبہ و کنشت میں سر مارتا ہو تو — سرگرم جستجو

تو ڈھونڈتا ہو جس کو چھپا وہ تجھی میں ہو — پر تو ہو بے خبر

ہو دورِ جام و صحبتِ یاران زندہ دل — کیفیتِ حیات

کچھ ہو اگر مزا تو یہی زندگی میں ہو — باقی ہو دردِ سر

افشائے رازِ عشق نہ کر کہہ کے جی کی بات — پردہ ہی خوب ہو

جی ہی میں اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہو — خاموش اے ظفر

جوں گل و بلبل چمن میں سب ہیں ہنستے بولتے
سیکھی ایک غنچے نے خاموشی ہمیں سے اس قدر

خاک ہو کر جو پڑا ہے ترے داماں سے دور
جاں نثار ایک ہی تھا وہ بھی تری جان سے دور

ہمارے آنسوؤں میں یوں ہے رازِ عشق ظفرؔ
کہ جس طرح سے ہو خوش بو گلاب کے اندر

پہنچتے ہیں کہیں مر مر کے تا سرِ منزل
عزیز، راہِ عدم اس قدر ہے دور دراز
خرامِ یار کے نزدیک ہے، بہت نزدیک
وگرنہ فتنۂ محشر ظفرؔ ہے دور دراز

کام زخمِ دلِ عاشق کو نہیں مرہم سے
اس پہ جراح لگادے کوئی تیزاب سی چیز
بے تمیزی ہے یہاں تک کہ زمانے میں ظفرؔ
نہ وہ تعظیم سی شے ہے نہ وہ آداب سی چیز

ہم کو رخصت ہو کہ اب آپ کی صحبت کے شریک
رات دن رہنے لگے سب کس و ناکس، اجی بس
کیوں مقابل ہوئے تھے حضرتِ دل عشق کے تم
ہو چکا آپ کا اتنے ہی میں دم کس، اجی بس
پوچھو مت حضرتِ ناصح مرا آکر احوال
سن کے مغموم نہ ہو خاطرِ اقدس، اجی بس
تار رونے کا وہ باندھا کہ نہ توڑا ہم نے
ہم سے ہر چند وہ کہتے رہے ہنس ہنس، اجی بس

ای ظفر دل نہ ہو کس طرح سے مضطر بے طرح
آج اس طرح کا دیکھا ہی طرح دار کہ بس

بھولا نہ تجھے یہ کبھی اس یاد کو شاباش — شاباش ہمارے دل ناشاد کو شاباش
ہر روز ستم تازہ ہی ہر روز نیا ظلم — ای شوخ ستمگر تری ایجاد کو شاباش
المنۃ للمنۃ کہ ہوئی اتنی تو تاثیر — کہتے ہیں وہ سن کر مری فریاد کو شاباش
مرغ چمن قدس کو اس دام سے کیا کام — پر کھینچ ہی لایا مجھے صیاد کو شاباش
ہی لاکھ خیالات میں فکر سخن ایسا — تیری ظفر اس طبع خداداد کو شاباش

وہ چشم ہو کیوں کر سحر و شام فراموش — میں مست ہوں مجھ سے ہو کہاں جام فراموش
ہو جس سے کہ اک بار ترا نام فراموش — وہ یادِ دو عالم سے ہو ناکام فراموش
اک میں بھی ترے دور میں ہوں رند سبوکش — کر مجھ کو نہ ای ساقی گل فام فراموش
لے سر پہ وبال اپنے اسیروں کا نہ صیاد — اتنا بھی نہ ہو رکھ کے تہ دام فراموش

ہر طرح غیر کی دل جوئی ہی معقول چہ خوش — ہم سے ہر بات پہ بدخوئی ہی معقول چہ خوش
بات معقول کہوں پیش تو کہے طرز سے وہ — تو اتالیق مرا کوئی ہی معقول چہ خوش
گریہ ہی ختم فقط سوختہ جاں پر میری — کہتے ہیں شمع بھی کچھ روئی ہی معقول چہ خوش

غربت میں اگر آب بقا بھی ہو تو اس سے
بہتر مرے نزدیک ہی خاکِ وطنِ خشک

ظفر کمال ہی تکلیف دل کے ہاتھوں سے — جو میرا بس ہو تو سینے سے دوں نکال کے پھینک

نہ ہووے جب تلک انساں کو دل سے میل یک جانب
ظفر لوگوں کے دکھلانے کو یک سوئی سے کیا حاصل

نہ قاصد دل ہی نہ کوئی نامہ بر دل ہو جائے ہے کچھ آپ ہی دل کو خبر دل

زیبا ہو کیوں نہ ہاتھ میں ساقی کے جام مے
وہ ہے بہ رنگ شاخ تو یہ ہے بجائے گل
ہے ربط حسن و عشق کو آپس میں اے ظفر
گل ہے برائے بلبل و بلبل برائے گل

مر گئے اے وائے ان کی ناز برداری میں ہم
دل کے ہاتھوں پڑ گئے کیسی گرفتاری میں ہم
سب پہ روشن ہے ہماری سوزشِ دل بزم میں
شمع ساں جلتے ہیں اپنی گرم بازاری میں ہم
کب ہنسایا گردشِ گردوں نے ہم کو شکل گل
مثل شبنم ہیں ہمیشہ گریہ و زاری میں ہم

ہزار غنچے گلستاں میں ہو رہے ہیں تنگ
ظفر جہاں میں نہیں ہے کہیں فراغ کا نام

تیرے حبا دن سے خاک پا ہیں ہم خاک ہیں لیک کیمیا ہیں ہم

ہم دمو امثل صورت تصویر　　کیا کہیں تم سے، بے صدا ہیں ہم
ہم ہیں جوں زلفِ عارض خوباں　　گو پریشاں ہیں خوش نما ہیں ہم
اے ظفر پوچھتا ہے ہم کو صنم　　کیا کہیں بندۂ خدا ہیں ہم

کرتے لغزے سے جو یہ دعوئ ایماں ہیں ہم
کفر یہ ہے اسے توڑیں تو مسلماں ہیں ہم
کیوں کہ کچھ لے سکیں ہم وہ ہی نہ دے دے جب تک
صاحب خانہ یہاں اور ہے مہماں ہیں ہم
نہ تو ہیں نگہت گل اور نہ ہم دودِ چراغ
پر ہے یہ حال کہ با حال پریشاں ہیں ہم

ہم دمو جس دن محبت میں قدم رکھیں گے ہم
دیکھ لینا اس کو بھی اپنا سا کر رکھیں گے ہم
جان و دل تاب و تواں لو تم ہی رکھو اپنے پاس
یاں ہجوم غم میں کس کس کی خبر رکھیں گے ہم
گزرے ہم اس سر سے قاتل کیا کریں گے رکھ کے سر
ایک سر کے ساتھ سو کیوں دردِ سر رکھیں گے ہم

اے ظفر سو چکے آرام سے ہم پاؤں پسار
سو قیامت ہوئی اک آنکھ کے لگ جانے میں

الہٰی جلوہ فرما کون ہے یاں روز و شب ایسا　　مہ و خورشید جو بن کر تماشائی سے پھرتے ہیں

یا تو اپنے پاس تھے وہ یا قریب اوروں کے ہیں
جو نصیب آگے تھے اپنے وہ نصیب اوروں کے ہیں

تیرے نالے وہ بلا جانکاہ ہیں اک گل نو کیا
کرتے یہ دل میں اثر ای عندلیب اوروں کے ہیں

عشق کی تعلیم ہی ہم کو جنوں کی تربیت
عقل سے کہہ دو کہ حضرت آپ ادیب اوروں کے ہیں

ایسے بخت اپنے کہاں آئے ہمارے گھر وہ ماہ
ای ظفر اس امر میں طالع عجیب اوروں کے ہیں

تھک کے ہم راہ محبت میں جہاں بیٹھے ہیں — اور رواں ہم سے بہت راہ رواں بیٹھے ہیں
نشۂ غفلت کا ہی اتنا کہ نہیں سوجھتا کچھ — آئے کس جا سے ہم اور کہاں بیٹھے ہیں

تدبیر کو سو طرح کی تدبیر سے بدلوں — تقدیر کو کس طرح سے تقدیر سے بدلوں
وابستہ ہی نہیں دل کو ظفر آہ جو بس ہو — اس غنچے کو میں غنچۂ تصویر سے بدلوں

رات دن تیرا تصور ہی خیال اور نہیں — کہ سوا اس کے محبت کا کمال اور نہیں
آپ میں ڈھونڈ اسے اور کہاں ڈھونڈے گا — کہ بجز تیرے کہیں جلوے وصال اور نہیں

دل انسان کے آئینے میں دیکھ اس کو ظفر
کہ نظیر اس کا نہیں اس کی مثال اور نہیں

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
ای بتو بندہ خدا کا ہوں گنہ گاروں میں ہوں

میری ملت ہے محبت، میرا مذہب عشق ہی
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دیں داروں میں ہوں

صفحۂ عالم پہ مانند نگیں مثل قلم
یا سیہ رویوں میں ہوں میں یا سیہ کاروں میں ہوں
نہ مرا مونس ہی کوئی اور نہ کوئی غم گسار
غم مرا غم خوار ہی میں غم کے غم خواروں میں ہوں
جو مجھے لیتا ہی پھر وہ پھیر دیتا ہی مجھے
میں عجب اک جنس ناکارہ خریداروں میں ہوں
ای ظفرؔ میں کیا بتاؤں تجھ کو جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

چیدہ چیدہ مہ جبیں اچھے جو دل بُردہ سے ہیں
ہم سے کچھ چیں بر جبیں رہتے ہیں آزردہ سے ہیں
نیستی پھیرا خزاں کا کیا پھر آیا باغ میں
پھول پژمردہ سے ہیں مرغ چمن مُردہ سے ہیں
تیرا قامت وہ قیامت ہی کہ ای محشر خرام
فتنہ وہنگامہ دونوں جس کے آوردہ سے ہیں
شعر افسردہ ظفرؔ کے مت سناؤ بزم میں
عشق کے مارے ہوے جتنے ہیں افسردہ سے ہیں

یوں تو افسانہ مرا وہ نہیں سنتا ای دل
اُس سے یہ قصہ دم خواب کہے تو کہہ دوں؟

کہیں میں غنچہ ہوں وا شد سے اپنی خود پریشاں ہوں
کہیں گوہر ہوں اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں

کہیں میں ساغر گل ہوں کہیں میں شیشۂ مل ہوں
کہیں میں شورِ قلقل ہوں کہیں میں ہوئے مستاں ہوں

کہیں میں جوشِ وحشت ہوں کہیں میں محو حیرت ہوں
کہیں میں آب رحمت ہوں کہیں میں داغِ عصیاں ہوں

کہیں میں برق خرمن ہوں کہیں میں ابرِ گلشن ہوں
کہیں میں اشک دامن ہوں کہیں میں چشم گریاں ہوں

کہیں میں عقل آرا ہوں کہیں مجنونِ رسوا ہوں
کہیں میں پیرِ دانا ہوں کہیں میں طفلِ ناداں ہوں

کہیں میں دست قاتل ہوں کہیں میں حلق بسمل ہوں
کہیں زہرِ ہلاہل ہوں کہیں میں آبِ حیواں ہوں

کہیں میں سرو موزوں ہوں کہیں میں بیدِ مجنوں ہوں
کہیں گل ہوں ظفرؔ میں اور کہیں خار بیاباں ہوں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابروئے پُرخم ایسے ہیں
ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو ہاں ہم ایسے ہیں

اتنا کھایا غم دُنیا میں غم کے پُتلے بن گئے ہم
اس پر بھی کچھ غم نہیں ہم کو ہم بھی بے غم ایسے ہیں

گُل ہی کہیں اور خار کہیں ہی نور کہیں اور نار کہیں ہی
ایک ہی عالم کیا ہی ہزاروں اس کے عالم ایسے ہیں

کیوں کہ ہم دُنیا میں آئے کچھ سبب کھلتا نہیں
اک سبب کیا بھید واں کا سب کا سب کھلتا نہیں

دل ہی یہ غنچہ نہیں ہی اس کا عقدہ ای صبا
کھولنے کا جب تلک آئے نہ ڈھب کھلتا نہیں

شاہد مقصود تک پہنچیں گے کیوں کر دیکھیے
بند ہی باب تمنا، ہی غضب کھلتا نہیں

کس طرح معلوم ہووے اس کے دل کا مدعا
مجھ سے باتوں میں ظفرؔ وہ غنچہ لب کھلتا نہیں

جی میں کیا تیرے سمایا اسے کیا کہتے ہیں
ہم سے ہر وقت کنایا اسے کیا کہتے ہیں

پوچھا ہر چند بھرے کان تمھارے کس نے
نہ بتایا نہ بتایا اسے کیا کہتے ہیں

گرمیٔ خوں سے سلگتا ہی تھا دل اور ظفرؔ
سرد مہری نے جلایا اسے کیا کہتے ہیں

وہ تیر اور ہی جس تیر کا فگار ہوں میں
وہ دام اور ہی جس دام کا شکار ہوں میں

وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا
اُسی کے پیچھے رواں صورت غبار ہوں میں

نہ میں ہوں طائر بسمل نہ ماہی بے آب
الٰہی کیا ہوں میں بے تاب و بے قرار ہوں میں

سمجھ عشق میں بے ہوش و بے خبر ہیں مجھے
خبر نہیں کہ خبردار و ہوشیار ہوں میں

چھپ کے وہ بیٹھ رہیں یا مجھ سے یہ ممکن ہی نہیں
میں سحر کنے نہیں دینے کا نظر میں سے انھیں

یار دل مانگے نہ دوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟
اور اگر دے دوں تو لوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟

حضرت دل عشق کے رستے سے میں واقف نہیں
کس طرف جاؤں چلوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟

اپنا احوال محبت سامنے اس کے ظفر
آپ میں لکھ کر پڑھوں کیوں کر کہو تو کیا کروں؟

کیا کہوں میں کس نشے میں رات دن مخمور ہوں
ایسی کیفیت میں ہوں اپنی خودی سے دور ہوں

خلق اپنے منہ سے جو کچھ مجھ کو کہتی ہے کہے
بندۂ غیور ہوں اس بات پر مغرور ہوں

جی دھڑکتا ہے نکل جائے نہ منہ سے حرف راز
یار سب ہشیار ہیں اور میں نشے میں چور ہوں

جلوہ گر ہے شمع حسن یار دل میں اے ظفر
صورتِ فانوس گویا نور سے معمور ہوں

خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

خوب ڈھونڈا خوب دیکھا کچھ نظر آیا نہیں
آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں

چشم ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا ہو یار
تم نے بھی اے دل کی آنکھوں اس کو دکھلایا نہیں

ہزاروں رنج و غم ہیں خانۂ دل میں نہیں کھلتا
کہ صاحب خانہ ان میں کتنے اور مہماں کتنے ہیں
سمجھنا عشق کو آفت اور اس آفت میں پھنس جانا
غرض دانا بھی ہم کتنے ہیں اور ناداں کتنے ہیں
مجھے شکوہ نہیں اس کے ستم کا کوئی کیا جانے
کہ اس میں لطف اس کے کتنے اور احسان کتنے ہیں

بھری ہو دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں
سُنے یہ کون مصیبت کہوں تو کس سے کہوں
رہا ہو تو ہی تو غم خوار اے دل غم گیں
ترے سوا غم فرقت کہوں تو کس سے کہوں
نہ مجھ کو کہنے کی طاقت کہوں تو کیا احوال
نہ اس کو سننے کی فرصت کہوں تو کس سے کہوں
کسی کو دیکھتا اپنا نہیں حقیقت میں
ظفر میں اپنی مصیبت کہوں تو کس سے کہوں

شگفتگی کی ہوس سے بھرا ہو ہر غنچہ	دل اس چمن میں کوئی خالی آرزو سے نہیں
ظفر اس اپنے تصور کے جائیے قرباں	مگر کبھی یار کی تصویر روبرو سے نہیں

زہد و تقوا یہ تجھی کو ہو مبارک زاہد　　خوب گزرے ہے مری مستی و مے خواری میں

ظفر شعر و سخن سے راز دل کیوں کر نہ ہو ظاہر
کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

ناقوس و جرس میں ہی نہ یہ نالۂ نے میں　　آوازۂ حق ہے تو کسی اور ہی لے میں

نہ دیکھا دیر میں تو کیا حرم میں دیکھے گا　　وہ تیرے پیش نظر واں نہیں تو یاں بھی نہیں

کرے نظارۂ گل زار جہاں اے غافل　　پھر میسر یہ تماشا کبھی ہونے کا نہیں

نہ جب تک خو تری اے کج کلہ الٹی سے سیدھی ہو
کہاں برگشتہ بختوں کی نگہ الٹی سے سیدھی ہو
ظفر تقدیر سیدھی جس کی ہو اس کی عنایت سے
کرے وہ بات الٹی جس جگہ الٹی سے سیدھی ہو

واہ وا تم کھاؤ غیروں کے نصیبوں کی قسم　　اے زہے تقدیر گر تقدیر ہو ایسی تو ہو
دیدہ در بند ہوس ہے دل ہے پابند ہوا　　قفل ہو ایسا تو ہو زنجیر ہو ایسی تو ہو
غفلت دنیا کا ثمرہ دیکھا عقبیٰ میں ظفر
خواب ہو ایسا تو ہو تعبیر ہو ایسی تو ہو

رونا میرا پوچھتے کیا ہو آنکھ سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصوّر اور بندھا ہو ایک ذرا چپ رہنے دو

کیا رنگ دکھائی ہو یہ چشم ترا وہو ہو
خونِ جگر آہا ہا لختِ جگر اوہو ہو
کیا شور شرابہ ہو غم خانۂ عالم میں
ہر دم اِدھر آہا ہا ہر دم اُدھر اوہو ہو
ہستی سے عدم تک ہم مر مر کے پہنچتے ہیں
اک دم کی مسافت پر اتنا سفر اوہو ہو
غفلت کا ظفر پردہ اٹھ جائے جو آنکھوں سے
آجائے تماشا پھر کیا کیا نظر اوہو ہو

وہ مری جان مرے پاس آئے تو کیا اچھا ہو
اور نہیں جان نکل جائے تو کیا اچھا ہو
نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اچھا کہ برا
کوئی اس بھید کو بتلائے تو کیا اچھا ہو
ساغر جم میں جو آتی تھی نظر کیفیت
وہ نظر دل ہی میں آجائے تو کیا اچھا ہو
کوچہ تنگ ہو دنیا نہیں آرام کی جا
یاں کوئی پانو نہ پھیلائے تو کیا اچھا ہو
آئے سب ایک نظر گریہ دوئی کا پردا
اے ظفر آنکھ سے اٹھ جائے تو کیا اچھا ہو

اچھا ہو گر کلام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو
تسکینِ دل تمام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو
جا سکتا کوئی اس بتِ خود کام تک نہیں
جاوے تو کیوں کہ کام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو
وہ کون ہو سوا ترے دیوانے کے جسے
پروائے ننگ و نام نہ ہو کچھ نہ کچھ تو ہو

رسمِ الفت نہ عدوئے دل وِدیں سے پوچھو
دوستو اس کو جو پوچھو تو ہمیں سے پوچھو

روشِ نقشِ قدم خاک میں ملنے کا مزا
اپنے کوچے کے کسی خاک نشیں سے پوچھو

مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم سببِ سوزشِ عشق
اک ذرا اپنے ہی حسنِ نمکیں سے پوچھو

دل کو از بر ہیں محبت کے مطالب سارے
بے تکلف یہ بتائے گا کہیں سے پوچھو

محبت چاہیے باہم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو
خوشی ہو اس میں یا ہو غم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

ہم اپنا عشق چمکائیں تم اپنا حسن چمکاؤ
کہ حیراں دیکھ کر عالم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

ہمیشہ چاہتا ہے دل کہ مل کر کیجے مے نوشی
میسر جامِ جم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

غنیمت تم اسے سمجھو کہ اس غم خانے میں یارو
نصیب اک دم دلِ خرم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

کیا پوچھتے ہو کیوں کہ ملی دل سے چشمِ یار
بیمار جس طرح کوئی بیمار سے ملے

چمن میں ابرو مل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
لبِ شیشے میں رشکِ گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

کنارِ آب ہو مہتاب ہو ساغر ہو مینا ہو
جو یہ سامان کُل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
ہوا ٹھنڈی ہو آدھی رات ہو یا وہ ہو یا ہم ہوں
چراغ اس وقت گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
وہ ہوں کیلوں کی اوجھل میں اکیلے اور میں جا پہنچوں
ظفرؔ کیا کیا نہ غل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

بے تابی و زاری کی شکایت ہے عبث اب ہوتا ہے ظفرؔ عشق کے حالات میں سب کچھ

دیتی ہے نکلنے یہ کوئی کشتیٔ مقصود ہے ایک بلا گردش گرداب زمانہ
کیا سیر کرے کوئی کہ جوں سبزۂ شمشیر ہے تشنۂ خوں سبزۂ سیراب زمانہ
ہو کیوں کہ کسی سے ظفرؔ امید محبت
ہم جانتے ہیں جیسے ہیں احباب زمانہ

نہیں اے ہمدمو چلتا یہ دم آہستہ آہستہ
رواں ہے کارواں سوئے عدم آہستہ آہستہ
نہیں رہنے کا باقی دل میں خوں کا ایک قطرہ بھی
بہا دے گی ظفرؔ سب چشم نم آہستہ آہستہ

منزل عشق بہت دور ہے اللہ اللہ! ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفرؔ بیٹھ گئے؟

کیا کہوں کیوں کر تجھے رشک قمر دیکھا کیے
وہ نظر آئے نہ جن کو بھر نظر دیکھا کیے

آہ آتش بار سے دل اور جگر جلتے رہے
ہائے تم ای مردمانِ چشم تر دیکھا کیے

گر نہیں ہی ربط کچھ باہم تو پھر محفل میں شب
تم انھیں اور وہ تمھیں کیوں ای ظفر دیکھا کیے

اک شخص نے کل میری کہانی جو بیاں کی
بولے کہ کہیں گم نہ کریں راہ مسافر

اس بت کو خبر کیا ہو مرے دردِ نہاں کی
سچ ہی کہ وہی جانے ہی جس شخص پہ گزرے

جوں بادِ صبا گرچہ بہت سیر جہاں کی
پائی نہ کسی گل میں ظفر بوئے محبت

ہم ایسے سوزِ غمِ ہجر یار سے ہیں بنے
کہ داغ دل کے گل نو بہار سے ہیں بنے

کریں گے ذبح ہمیں دل برانِ کافر کیش
ازل سے ہم تو انھیں کے شکار سے ہیں بنے

جدا ہوں حسرت و اندوہ کس طرح ہم سے
کہ کنجِ غم میں یہی اپنے یار سے ہیں بنے

وہ میرے دشمن جاں ہیں یہ جان لیجے گا
تمھارے آن کے جو دوست نار سے ہیں بنے

عشق میں کیا ہم ہی ای تقدیر سیدھے ہو گئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہو گئے

میری سیدھی بات پر ہوتے ہیں ٹیڑھے ای ظفر
جب کہ ٹیڑھی میں نے کی تقریر سیدھے ہو گئے

اگر غفلت کا ہم پردہ اٹھاتے اپنی آنکھوں سے
توجو واں دیکھتے یاں دیکھ جاتے اپنی آنکھوں سے
ظفر گریہ ہمارا کچھ نہ کچھ تاثیر رکھتا ہی
اُنھیں ہم دیکھتے ہیں مسکراتے اپنی آنکھوں سے

جہاں میں ہم تو غم آلودہ اک جہاں کے رہے
رہے اسی میں یہاں کے رہے نہ واں کے رہے
پہنچ گئے سر منزل تو ہم سفر اور ہم
بھٹکتے گرد صفت پیچھے کارواں کے رہے

رکھا ہی عشق میں اس راہ پر ہم نے قدم اپنا
کہ جس رہ میں خضر سا میر منزل ہاتھ ملتا ہی

جب کوئی کہتا ہی ہستی کو کہ ہستی خوب ہی
اس کی غفلت پر فنا اس وقت ہنستی خوب ہی
توبہ اے ساقی نہیں پیئے کا یش جام شراب
مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہی
ملک دنیا کی تو آبادی ہی ویرانہ تمام
اور بستی ہی جہاں اک خلق بستی خوب ہی

دل ہی سے پوچھو عشق میں جو دل پہ بن گئی
بسمل ہی جانتا ہی جو بسمل پہ بن گئی

پہنچی نہ رفتگانِ عدم کی جو کچھ خبر
کیا جانے کیسی جاتے ہی منزل پہ بن گئی

ہستی کے باغباں کی ظفر پوچھتا ہے کیا
جو کچھ چمن میں جانِ عنادل پہ بن گئی

ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائیں گے
پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائیں گے

ہاں مدد کر جذبۂ الفت وہ دیکھیں کب تلک
آپ کو دور اپنے اس مائل سے کھینچے جائیں گے

ایک نقشہ اُن کے کاشانے کا کھینچا جائے گا
سیکڑوں نقشے مہِ کامل سے کھینچے جائیں گے

ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر لے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی اسی عقل بے تدبیر پھرتی ہے

عقل پر ناز ہے قدرت پہ نظر کس کو ہے
سب کو فکر آج کی ہے کل کی خبر کس کو ہے

دیکھ ہر غنچہ لیے دوش پہ ہے رختِ سفر
اس گلستاں سے نہیں عزمِ سفر کس کو ہے

اللہ اللہ رے درازی شبِ ہجراں تیری
صبحِ محشر تلک امیدِ سحر کس کو ہے!

دیکھنا عیب و ہنر اور کا ہے سب کو ظفر
اپنا معلوم ظفر عیب و ہنر کس کو ہے

رونقِ گلشن، بہارِ گل جو کم ہوتی چلی
اشکِ شبنم سے نسیمِ صبح دم روتی چلی

ہو چکے دن ضبطِ گریہ کے کہ پی جاتے تھے اشک
اب تو چشمِ تر ظفر کچھ آبرو کھوتی چلی

نکلنا دل سے اس پیکاں کا مشکل ہے تو بس یہ ہے
مری جاں ہے تو بس یہ ہے مرا دل ہے تو بس یہ ہے

جو قصد منزل مقصود ہی تو عشق پیدا کر کہ اس منزل میں اے دل پیر منزل ہی تو بس یہ ہی
کنارے گور کے جب عشق میں پہنچے تو یہ جانا کہ اس دریائے بے پایاں کا ساحل ہی تو بس یہ ہی

جلوہ یہ اُس نے دکھایا مرا جی جانتا ہی کہ خدا ہی نظر آیا مرا جی جانتا ہی
اُٹھ گئی میری زباں پر سے جہاں کی لذت جو مزا عشق میں پایا مرا جی جانتا ہی
یا تو وہ جانتا ہی جو ہی مرے جی کا خیال اور یا بار خدایا مرا جی جانتا ہی
اے ظفرؔ اس گل خنداں کی محبت نے تجھے
دم بدم جیسا رُلایا مرا جی جانتا ہی

دیکھوں جو مرقعے کو تو جی کیوں کہ نہ تڑپے
صورت کوئی مل جائے ہی صورت میں کسی کی

بزم اور ہی یار اور ہیں دَور اور ہی ہیں گے
وہ یار نہیں بزم میں اور اور ہی ہیں گے
بے مہری اک انداز ہی اس کا نہیں شیوہ
اس قاتل سفاک کے جور اور ہی ہیں گے
کب سنتے ہو تم غور سے احوال ہمارا
اس حال پہ جو کرتے ہیں غور اور ہی ہیں گے
کیا جانتا ہی کوئی ظفرؔ شیوۂ خوباں
ان لوگوں کے طرز اور ہیں طور اور ہی ہیں گے

نامہ بر سے پہلے میرا نام سن کر ہنس پڑے
پھر سنا پیغام تو پیغام سن کر ہنس پڑے

بزم میں بہکی زباں ساقی کی کچھ اس لطف سے
جام و مینائے مئے گل فام سن کر ہنس پڑے

یہ غرور جاہ غافل وہ ہنسی کی بات ہے
خاک میں جم گور میں بہرام سن کر ہنس پڑے

رنج و قلق ہے درد و الم ہے حسرت ہے ناکامی ہے
دوری میں اُس راحتِ جاں کی کیا کیا بے آرامی ہے

ہر غنچہ و گُل ہے شکل وہاں گُل برگ نہیں گویا ہے زباں
ہوتی ہے چمن میں کس کی بیاں توصیف سمن اندامی ہے

آہ و فغاں کے ساتھ دھُواں سا ہر دم منھ سے نکلے ہے
دل تو جل کر خاک ہوا پر اب بھی جگر میں خامی ہے

کس کی حمایت ڈھونڈیں ہم اور کس سے ہم چاہیں ظفرؔ
رکھتے نظر ہیں اپنی خدا پر وہ ہی ہمارا حامی ہے

کیا کچھ نہ کیا اور ہیں کیا کچھ نہیں کرتے
کچھ کرتے ہیں ایسا بخدا کچھ نہیں کرتے

اپنے مرض غم کا حکیم اور کوئی ہے
ہم اور طبیبوں کی دوا کچھ نہیں کرتے

کرتے ہیں وہ اس طرح ظفرؔ دل پہ جفائیں
ظاہر میں یہ جانو کہ جفا کچھ نہیں کرتے

نہ ہنسو دیکھ کے تدبیر کو پلٹے کھاتے　　دیر لگتی نہیں تقدیر کو پلٹے کھاتے
دل کو دیکھو مرے بے تاب نہ دیکھا ہوگا　　تہِ خنجر کسی نخچیر کو پلٹے کھاتے
بخت برگشتۂ عاشق نے نہ کھایا پلٹا　　عمر گزری فلک پیر کو پلٹے کھاتے

ای ظفر اُس سے نہ کر بات کہ دیکھا سو بار
ہم نے اس یار کی تقریر کو پلٹے کھاتے

دل میں سو فکر و خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں
اس کو معمورہ کہے کوئی کہ ویرانہ کہے؛
ای ظفر چاہیے انساں کو کہے ایسی بات
کہ بُرا بھی نہ کہے کوئی گر اچھا نہ کہے

اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن　　ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہی

بادۂ دنیا سے ہم کو اس لیے نفرت سی ہی
اس میں کیفیت نہیں کچھ بھی مگر غفلت سی ہی

خدا کے رُو بہ رُو عزت رہے گو اہل دنیا نے
مری تعظیم کم کردی مری توقیر کم کردی

کسی پردہ نشیں کا ہی شوق لقا کوئی طرح اب ایسی بتائے مجھے
کہ اٹھا کے وہ پردۂ شرم و حیا ذرا اپنا جمال دکھائے مجھے

ترے دیکھنے کے تو ہیں سیکڑوں ڈھب نہیں دیکھتا میں تو یہی ہے سبب
کہ تجلئ حسن سے برق غضب کہیں ایسا نہ ہو کہ جلا دے مجھے

لگے بات کا میری ٹھکانا کہاں کہ جب ایک سخن میں وہ سحر زباں
کبھی عرش بریں پہ چڑھا دے مجھے کبھی فرش زمیں پہ گرا دے مجھے

نہ ہو دام علائق جسم اگر کروں عالم قدس کی سیر ظفر
کوئی ایسا ہو کامل پاک نظر کہ جو قید ہے اس سے چھڑا دے مجھے

ای ظفر توبہ تو کی پر مے کشی پر دیکھنا
آپ کیا کیا محفل احباب میں لہرائیں گے

خاک داں ہے یہ جہان گزراں وہ کہ جہاں
ہیں بہت چھان رہے خاک بہت چھان گئے

بوالہوس عشق کا دم بھرتے تھے لیکن اس نے
امتحاں کا جو لیا نام تو اوسان گئے

ساکن کنج عدم مسکن ہستی میں ظفر
آئے یوں جیسے کہ دو دن کہیں مہمان گئے

ظفر کیا پوچھتا ہے راہ مجھ سے اس کے ملنے کی
ارادہ ہو اگر تیرا تو ہر جانب سے رستہ ہے

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے ای دل کبھی ایسی تو نہ تھی

اب کی جو راہ محبت میں اٹھائی تکلیف
سخت ہوتی ہمیں منزل کبھی ایسی تو نہ تھی

نگہ یار کو اب کیوں ہے تغافل ای دل
وہ ترے حال سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی

پاس خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا ورنہ ہوتا دام سو ٹکڑے اگر پر مارتے

کوئی ہشیار نہیں جو ہی وہ سرمست و خراب
بزم دنیا عجب اک بزم خرابات سی ہی

کیسی ہوا چلی چمن دل میں ای ظفر سب برگ و بار نخل تمنا کے جھڑ پڑے

بت پرستی جس سے ہووے حق پرستی ای ظفر
کیا کہوں تجھ سے کہ وہ طرز پرستش اور ہی

ای ظفر کچھ ہوسکے تو فکر کر عقبیٰ کا تو کر نہ دنیا کا تردد کار دنیا سہل ہی

ترا دیوانہ مجنوں سے سوا مشہور عالم ہی مگر مروہ پرستی شیوہ و دستور عالم ہی
وہ عالم میں ہی پر عالم سے ہی اس کا جدا عالم اُسے کب پا سکے عالم یہ کب مقدور عالم ہی
ستم ہی یہ کہ وہ شوخ ستم گر اس ستم پر بھی پسند خلق مقبول جہاں منظور عالم ہی

صحبت گل ہی فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آج کل سارے چمن کی ہی ہوا بگڑی ہوئی
دل شکستوں کا سخن کیوں کر نہ ہووے نادرست
ساز بگڑے ہی تو نکلے ہی صدا بگڑی ہوئی
میں سبھی باتیں بنانے پر ہیں قائل اس کے ہم
ای ظفر جو بات دے کوئی بنا بگڑی ہوئی

ہی یہ ڈر دل کو نہ چشم مست مہ وش کھینچ لے
اپنے مشرب میں نہ اس صوفی کو مَوکش کھینچ لے

ترا جس دن سے عالم مَیں نے دیکھا مجھے بھی دیکھنے عالم لگا ہی

محفل سے تیری اٹھ کے جو ہم صبح دم چلے مانند شمع داغ بہ دل چشم نم چلے
دیوانے تیرے قید سے ہستی کی چھوٹ کر کیا با فراغ جانب کوئے عدم چلے
کیا جانے راہ عشق کی تکلیف بوالہوس معلوم ہو جو ساتھ مرے دو قدم چلے

تری جب بے وفائی پر دل اتنا مبتلا ہووے
اگر تجھ میں وفا ہووے تو پھر کیا جانے کیا ہووے

نہ ہو سکتے بیاں ظلم و ستم بسمل سے قاتل کے
کھلے جوہر زبانِ خنجرِ قاتل سے قاتل کے
کوئی ہی چھوٹنا آساں قیامت تک نہ چھوڑے گا
کہ پہنچا خوں مرا دامن تلک مشکل سے قاتل کے

ظفر ہزار حرم و صنم کدہ سے بہتر ہی اگر نصیب ہو کنج فراغ میں پانی

نہ دائم غم ہی نَے عشرت کبھی یوں ہی کبھی ووں ہی
تبدّل یاں ہی ہر ساعت کبھی یوں ہی کبھی ووں ہی

گریباں چاک ہوں گا ہے اُڑتا خاک ہوں گا ہے

لیے پھرتی مجھے وحشت کبھی یوں ہی کبھی ووں ہے

جو شکل شیشہ گریاں ہوں تو مثل جام خنداں ہوں

غرض حال غم فرقت کبھی یوں ہی کبھی ووں ہے

عیب و ہنر نہ پوچھو تم آدمی میں کیا ہے — تم میں بھی کچھ نہ کچھ ہی پیارے ہمیں میں کیا ہے

دونوں ہیں ایک ہم کو جانے بلا ہماری — افسردگی میں کیا ہے اور خرمی میں کیا ہے

ظفر سایے سے بھی گردش زدوں کے چاہیے بچنا

کہ ہم گردش میں آئے جب سے زیر آسماں آئے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے
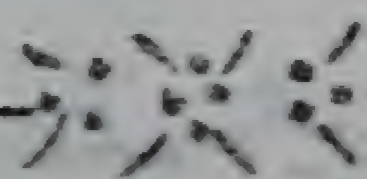
دیوانِ دوم

پہچانا اُسے تونے جسے دیکھا نہ بھالا — شاباش دلا اے تبارک اللہ تعالیٰ

بازارِ محبت میں نہ دل بیچ تو اپنا — بک جاتا ہے ساتھ اس کے ظفر بیچنے والا

کھلے ہزار در باغ دل کشا لیکن دل گرفتہ مرا بند ہی رہا نہ کھُلا

مئے عشرت نہ تھی طالع میں اپنے ساقیا ورنہ
فلک مینا لیے پھرتا تو مہ ساغر لیے پھرتا

نشے نے بزم ساقی میں جو مستوں کو اُڑا مارا
لبِ ساغر پہ منھ شیشے نے دھر کر قہقہہ مارا
نہ تھا کچھ دور تو رستہ بہت اس یار کے گھر کا
مگر ہم کو ہماری ناتوانی نے تھکا مارا

کیا کہوں ہے کیا بتوں کی آشنائی میں مزا
وہ مزا سب اس میں ہے جو ہے خدائی میں مزا
مسجد و بت خانے میں ٹکرایا سر کو بے مزا
تیرے سنگِ در پہ آیا جبہ سائی میں مزا
جا سکے گلشن تلک اڑ کر نہ ہم بے بال و پر
ہم نے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا

خوب ہو گا ہاں جو سینے سے نکل جائے گا تو
چین مجھ کو اے دلِ خانہ خراب آجائے گا
جانے دو جاتا ہے گر عمر رواں کا قافلہ
ٹھیر جائے گا کہیں آخر کہاں تک جائے گا

بھولے سے بھی جدھر وہ قدم پاؤں پڑ گیا
کوسوں اُدھر دلوں ہی کا ستھراؤ پڑ گیا

زہراب دے نہ تیغ نگہ کو عتاب سے
اچھا نہ ہوگا دل پہ اگر گھاؤ پڑ گیا

سلجھے گا کیوں کہ دیکھیے دل زلف یار سے
بے طرح اس میں اُس میں ہی الجھاؤ پڑ گیا

جو کعبے میں ہی شیخ وہی بت کدے میں ہی
ناحق کا تیرے دل میں یہ بھٹکاؤ پڑ گیا

بازی لگا دے عشق کی جو سر میں شوق ہے
پو بارہ ہیں ظفرؔ جو کوئی داؤ پڑ گیا

کر نہ شکوہ کہ مجھے یہ نہ دیا وہ نہ دیا
شکر کر تو کہ دیا ہی تجھے انسان بنا

نہ دوں گا دل اسے میں یہ ہمیشہ کہتا تھا
وہ آج لے بھی گیا اور ظفرؔ سے کچھ نہ ہوا

کیا سنے فریاد میری ہی وہ گل نازک دماغ
باغ میں غنچہ اگر چٹکے کہے غل کیوں ہوا؟

راز دل جس سے کہا دوست سمجھ کر اپنا
ای ظفرؔ ہم نے اسے جان کا دشمن دیکھا

گیا کیا کیا گزر عالم ظفرؔ آنکھوں کے آگے سے
کہیں کیا ہم نے جو یاں مثل چشم نقش پا دیکھا

یاں آئے کہاں سے ہیں کہاں جائیں گے یاں سے
حیراں ہیں ظفرؔ ہم پہ معما نہیں کھلتا

ہم نشیں ہو نا غمِ الفت میں جو تھا سو ہوا
شکوہ بے جا ہی مری قسمت میں جو تھا سو ہوا

کب ہوا تدبیر سے حاصل ظفرؔ مقصودِ دل
ای نکو نیت تری نیت میں جو تھا سو ہوا

دُنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا

نہ اس کا بھید یاری سے نہ عیاری سے ہاتھ آیا
خدا آگاہ ہی دل کی خبرداری سے ہاتھ آیا

نہ ہوں جن کے ٹھکانے ہوش وہ منزل کو کیا پہنچیں
کہ رستہ ہاتھ آیا جس کے ہشیاری سے ہاتھ آیا

ہوا حق میں ہمارے کیوں ستم گار آسماں اتنا
کوئی پوچھے کہ ظالم کیا ستم گاری سے ہاتھ آیا

اگر کچھ مال دنیا ہاتھ بھی آیا حریصوں کے
تو دیکھا ہم نے کس کس ذلّت و خواری سے ہاتھ آیا

سرنامہ میرے نام کا اور خط رقیب کا ظالم ترے ستم کے ہیں عنواں عجب عجب
غمزہ عجب نگاہ عجب اور ادا عجب کچھ دل رُبائیوں کے ہیں ساماں عجب عجب

وہ لوگ اس زمانے میں ہیں ای ظفرؔ کہاں
دیکھے ہوئے ہیں آپ نے انساں عجب عجب

برسا ہزار بار یہاں ابرِ نو بہار
نخلِ مراد پر نہ ہوا اپنا آہ سبز

کب رہتی ہے دُنیا میں بہارِ گل و گلشن
دو دن میں اُڑا دے ہے ظفر بادِ خزاں خاک

شاخِ گل جیسے ہَوا سے جھومتی ہے باغ میں
ہے ظفر یوں چال میں اُس تیرے متوالے کی جھوک

جو ہوتے ہم نہ جہانِ خراب میں داخل
تو ہوتے کاہے کو رنج و عذاب میں داخل

جو تیری چشم ہو بیدار دل بھی ہو بیدار
نہیں تو جاگنا تیرا ہے خواب میں داخل

بچا تھا کچھ ترے رخسار سے ازل میں نور
ہوا وہ چشم مہ و آفتاب میں داخل

اگر جوان ہو دل پیر عشق کی دولت
تو اے ظفر ہے وہ تیرے شباب میں داخل

یہ جو دم کی آمد و شد ہے اسی میں اے ظفر
دم بدم اک سیر ہستی و عدم کرتے ہیں ہم

جن کو ایمان ہم اپنا بہ خدا گنتے ہیں
پوچھو وہ گبر کہ مومن ہمیں کیا گنتے ہیں

تو جدھر قبلۂ جاں اپنا تصور ہے اُدھر
اس تصور ہی کو ہم قبلہ نما گنتے ہیں

ظلم سہتے ہیں بجز شکر نہیں کچھ کہتے
ہم جفاؤں کو تری مہر و وفا گنتے ہیں

عالم صورت میں تو مثل صورت آدم میں ہوں
عالم معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

بڑھتے بڑھتے دل تلک پہنچا ظفرؔ زخم جگر
اور ہیں اب تک تلاش نسخۂ مرہم میں ہوں

آہ و فغاں یا نالے پیہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
تم کو کیا تنہائی میں ہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

وہ بے پروا ان کی بلا سے کوئی جیے یا کوئی مرے
ظلم و ستم عشاق پہ ہر دم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

چاک گریباں بال پریشاں ٹکڑے داماں خاک بسر
اپنا جنوں سے ہر یہ عالم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

مجھ سے خفا کیوں میری خطا کیا ہے تو قصور دیدہ و دل
مشورہ کرکے دونوں باہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

اے ظفرؔ ہم نے کیے جو جو زبردستی میں کام
ان کے بدلے مل رہے ہیں زیر دستی میں ہمیں

جان عالم ہو کوئی کیوں کر جدا رکھے تمھیں
زندگی ہے اے بتو تم سے خدا رکھے تمھیں

خود نما ہو تم کوئی پردے میں کیا رکھے تمھیں
وہ رکھے در پردہ جو دل میں چھپا رکھے تمھیں

تم تو ہو عیار لیکن وہ بڑا عیار ہے
اس بگڑنے پر جو یار اپنا بنا رکھے تمھیں

میں ہوں عاصی کہ پرخطا کچھ ہوں — تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں
جزو کل کو نہیں سمجھتا میں — دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں
جب کہ ناآشنا ہوں میں سب سے — تب کہیں اس سے آشنا کچھ ہوں
خواب میرا ہے عین بیداری — میں تو اس میں بھی دیکھتا کچھ ہوں
تم سے الفت نباہتا ہوں میں — باوفا ہوں کہ بے وفا کچھ ہوں

گرچہ کچھ بھی نہیں ہوں میں لیکن
اس پہ بھی کچھ نہ پوچھ کیا کچھ ہوں

دنیا کا ہے مزا ظفر انجام کار زہر — میٹھا سمجھ کے لوگ اسے للچا گئے تو ہیں

نہ ہم کچھ ہنس کے سیکھے ہیں نہ ہم کچھ رو کے سیکھے ہیں
جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں کسی کے ہو کے سیکھے ہیں

اے ظفر یہ ترے اشعار ہیں یا نالۂ زار — کیا بلا ہیں جو یہ یوں دل میں اتر کرتے ہیں

جو پہلے تھے یار اپنے اب ان کو کہاں ڈھونڈیں
باقی ہے نشاں کس کا ہم کس کا نشاں ڈھونڈیں
پیری میں ظفر بہتر ہے ہم دم دیرینہ
جو لوگ جواں ہوں وہ دل دار جواں ڈھونڈیں

جاؤ اس بن اگر آرام نہیں تم جانو — حضرت دل ہمیں کچھ کام نہیں تم جانو
تم مسلماں ہو ظفر خوب نہیں عشق بتاں — اور اگر یہ ہے تو اسلام نہیں تم جانو

وہاں کی مخلصی اے وائے قسمت ہو تو کیوں کر ہو
کہ میں آلودۂ عصیاں ہوں رحمت ہو تو کیوں کر ہو

واں تو کینہ ہو جفا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی اور کچھ نہ ہو
یاں محبت بے وفا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی اور کچھ نہ ہو
جو تمھاری نرگسِ بیمار کا بیمار ہو اس کے لیے
روز دارو ہو دعا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی اور کچھ نہ ہو
یہ ستم کیا ہی کہ ای قاتل ہمارے قتل کو خنجر بکف
تیرا غمزہ ہو ادا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی اور کچھ نہ ہو
وصل میں بھی کچھ نہ کچھ دھڑکا لگا ہے ہی ای ظفر کچھ ایسا ہو
یار ہو گوشہ جدا ہو یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو اور کچھ نہ ہو

جو دوست تھے وہ ہیں دشمن عجب تماشا ہی ہوا ہی دیکھو زمانے کا حال کیسا کچھ
مرے زوال سے جانو کماں کو میرے زوال یہ ہی تو ہو گا کمال کیسا کچھ
ظفر نکالے فلک نے جو کج روی کے ڈھنگ تو اک زمانہ ہوا پایمال کیسا کچھ

ہی یہ انبوہ غم و رنج و ہجوم حسرت نہیں سینے ظفر دم کے سمانے کی جگہ
کہاں تک یونہی ہر شب انجمن آرائی ہووے گی
پھر آخر ایک دن تو ہوگا اور تنہائی ہووے گی

نہیں معلوم ظفر ان سے ہوئیں کیا باتیں چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

عیش سے گزری کہ غم کے ساتھ اچھی نبھ گئی نبھ گئی جو اس صنم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

دوستی اس دشمن جاں نے نباہی تو سہی گو نبھی ظلم و ستم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
خوب گزری گرچہ اوروں کی نشاط و عیش میں اپنی بھی رنج و الم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
بوئے گل کیا رہ کے کرتی گل نے رہ کر کیا کیا وہ نسیم صبح دم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
شکر صد شکر اپنے منہ سے جو نکالی میں نے بات
ای ظفرؔ اس کے کرم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

واں رسائی نہیں تو پھر کیا ہی یہ جدائی نہیں تو پھر کیا ہی
گلہ ہوتا ہی آشنائی کا آشنائی نہیں تو پھر کیا ہی
اللہ اللہ رے ان بتوں کا غرور یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہی
موت آئی تو ٹل نہیں سکتی اور آئی نہیں تو پھر کیا ہی
نہیں رونے میں گر ظفرؔ تاثیر
جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہی

بحرِ غم میں دست و پا اک عمر مارے جائیں گے
اِس کنارے سے کہیں تب اس کنارے جائیں گے
کوئی حسرت ای فلک اپنی نکلنے کی نہیں
ساتھ ہی زیرِ زمیں ارمان سارے جائیں گے

ہمیں کیا کام جو ناحق سہارا غیر کا ڈھونڈیں
سہارا یاں خدا ہی کا کچھ ایسا ہی کہ کیا کہیے
بلا سے گر نہیں ہی سایۂ بالِ ہما سر پر
تری دیوار کا سایہ کچھ ایسا ہی کہ کیا کہیے

وہ ہی پیش نظر اور پھر نظر آتا نہیں ہرگز
پڑا غفلت کا اک پردا کچھ ایسا ہی کہ کیا کہیے

مزا جو کچھ کہ اس درد محبت میں ہی بے درد و!
وہ ہم سے پوچھتے ہو کیا کچھ ایسا ہی کہ کیا کہیے

ظفر دنیائے فانی خواب کا سا ایک عالم ہی
مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہی کہ کیا کہیے

بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے
سمجھانے والے مفت گنہ گار بن گئے

کیفیت اپنی چشم سیہ مست کی نہ پوچھ
صوفی تمام دیکھ کے می خوار بن گئے

کیسی بنے گی دیکھیے کیوں کر چھپے گا راز
غماز میرے دیدۂ خوں بار بن گئے

بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے جنھیں وہاں
جاتے ہی سب وہ اس کے طرف دار بن گئے

ہشیار رہنا چاہیے یاروں سے ای ظفر
ہیں یار اس زمانے کے عیار بن گئے

کیا خرد بد خواہ کیا تدبیر دشمن بن گئی
میرے حق میں خود مری تقدیر دشمن بن گئی

زلف مشکیں باندھتی ہی دل کی شکیں کس لیے
کیا خطا کیا جرم بے تقصیر دشمن بن گئی

ای ظفر اس وقت میں عزت ہی ذلت کا سبب
صاحب توقیر کی توقیر دشمن بن گئی

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزشِ غم سے
مگر منہ سے نہ اُف ہم غم گساروں میں نکالیں گے

ہزاروں عشق میں ای حضرتِ دل رنج و غم پہنچے
بہ افسوس اپنے مقصد کو نہ تم پہنچے نہ ہم پہنچے
تماشا اور رہی کچھ ہم نے دیکھا ساغرِ دل میں
ظفر کیا دخل کیفیت کو اس کی جامِ جم پہنچے

ڈرتا ہوں موجِ بحرِ محبت سے ای ظفر ہاتھ آتے آتے دامنِ ساحل ڈبو نہ دے

بُرے ہیں یا بھلے ہیں ای ظفر لیکن غنیمت ہیں
کہ یاں آئیں گے پھر پھر کر نہ ہم جیسے نہ تم جیسے

نہ جلے پر سوزِ دل گر جاں جل جائے تو یہ جائے
نہ جائے دردِ دل گر دم نکل جائے تو یہ جائے
نہیں جانے کی جیتے جی تو حسرت وصلِ جاناں کی
مگر ہاں بعدِ مردن اے اجل جائے تو یہ جائے
ظفر کیا کیا کہے ہیں شعر اس میں واہ وا تو نے
سخن فہموں کی محفل میں غزل جائے تو یہ جائے

دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفر واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

خوش اوقات، دیکھ خرابات والے ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے
جو دل میں تمھارے وہ ان کی زباں پر تمھارے ہیں عاشق کرامات والے
ہم اس کو سمجھتے ہیں جو سمجھے سے کہہ دو اشارات جانیں اشارات والے

خیال اور ہم اک عمر کہیں پہنچے
جہاں سے آئے تھے آخر کو پھر وہیں پہنچے

نہ پوچھو شعلے میں یہ کس کی گرمی پائی جاتی ہے
نہ پوچھو یہ شرارے میں شرارت کس کی ملتی ہے
کہو دل سے نہ کر فریاد اس انصاف دشمن سے
کہ واں داد اے گرفتار محبت کس کی ملتی ہے

تجھ کو بہکا دیا کسی نے ہے ہائے یہ کیا کیا کسی نے ہے
ہم نے دیکھا ہے جو ستم تیرا نہیں اب تک سنا کسی نے ہے
کیا مزے میں گزرتی تھی لیکن کر دیا بے مزا کسی نے ہے
اے ظفر رو دیا ہے جب میرا کچھ سنا ماجرا کسی نے ہے

گل کیوں نہ کھلے روز کہ ہاتھوں سے فلک کے ہوتا ظفر اک سینۂ فگار اور سیا ہے

تمھاری بے وفائی کا تو ڈر پہلے سے ہم کو ہے
نہیں ہم بے خبر اس کی خبر پہلے سے ہم کو ہے

کہیں کی ایک دن دل سے خلش اُس شوخ کی مژگاں

کہ کھٹکا ہو گیا یہ ای ظفر پہلے سے ہم کو ہی

نہ تو کچھ کفر ہی نہ دین کچھ ہی | ہی اگر تو ترا یقین کچھ ہی
دیر و کعبے میں ڈھونڈتا کیا ہی | دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہی

عدم میں بھی مصیبت کچھ نہ پوچھو ہائے ایسی ہی

جہاں دم مارنے کی جا نہیں واں چلے ایسی ہی

نہ پوچھو دوستوں کی اپنے حالت اپنی فرقت میں

کہ جس کو دیکھ کر دشمن کو بھی رحم آئے ایسی ہی

نزاکت کیا کہوں دل کی عجب نازک کلی ہی دل

سخن کی اک ذرا گرمی سے جو مرجھائے ایسی ہی

اُس نگاہِ مست کے مستوں کی مستی اور ہی

اور مے ہی اور ان کی مے پرستی اور ہی

ای ظفر بستے ہیں دل میں رنج و غم درد و الم

اب تو کچھ اس خانۂ ویراں میں بستی اور ہی

نہ بدخواہوں سے کچھ ہوگا نہ ہوگا خیر خواہوں سے

جو کچھ تقدیر کی اپنی ہی گردش ہونے والی ہی

رہا گر شور زور اپنے دل شوریدہ کا یوں ہی

تو اک دن مثل شور حشر شورش ہونے والی ہی

بہا گر آنسوؤں کا آنکھ سے دریا تو کیا حاصل
فرو کب اس سے میرے دل کی سوزش ہونے والی ہے

کیا اس ماہ وش سے ای فلک تونے جدا ہم کو
نہ تھے واقف کہ تیری یوں بھی گردش ہونے والی ہے

مجھے جو یار میرے آئے ہیں سمجھانے کیا سوجھی
جو مجھ کو عشق میں سوجھی کوئی کیا جانے کیا سوجھی

وہ سب دنیا میں ہیں جتنے مزے ہیں زندگانی کے
خدا جانے کیا کیوں ترک اسے دانا نے کیا سوجھی

لگے جب کسی سے لو تو پھر ایسی ہی سوجھے ہے
نہ پوچھو ڈھبر کیوں جل کر ہوے پروانے کیا سوجھی

جو اس عینک میں سوجھے ہے وہ پوچھو می پرستوں سے
کہ جب تم نے چڑھائے بھر کے دو پیمانے کیا سوجھی

آنے کی جی میں یاں تم کیوں ٹھانتے نہ آتے
کھینچا ہے جذب دل نے، جب جانتے نہ آتے

ہوتا حذر نہ تم کو گر خاک سے ہماری
دامن کو تم وہیں سے گرد انتے نہ آتے

ہم سامنے تمہارے آئے تھے سادگی سے
تیور اگر تمہارے پہچانتے نہ آتے

شکر للہ ہم سے یہ کافر صنم اچھے رہے
حق پرستو بت پرستی میں بھی ہم اچھے رہے

وہ برا کہتے رہے ہم کو پر ان کے عشق میں
جیسے ہم اچھے رہے ایسے بھی کم اچھے رہے

مر کے تو ہو جائیں گے سب خاک لیکن جیتے جی
جو رہے اس یار کی خاک قدم اچھے رہے

ہم نے اس ہستی میں نہ کر وہ اٹھائے رنج و غم
جو روانہ ہو گئے سوئے عدم اچھے رہے

ہے یہاں کی اشک باری رحمت باری ظفر
ابر آسا جو رہے با چشم نم اچھے رہے

رہتا زباں پہ آٹھ پہر کس کا نام ہے؟
کرتا ہے یہ جو دل میں اثر کس کا نام ہے؟

ہم کو کسی کے عیب و ہنر کی خبر نہیں
کہتے ہیں عیب کس کو ہنر کس کا نام ہے

بدنام ہے جہاں میں ظفر جن کے واسطے
وہ جانتے نہیں کہ ظفر کس کا نام ہے

ہم اس چشم تصور ہی کو اپنا جام جم سمجھیں
اسی میں ہم کو کیفیت نظر بہتیری آتی ہے

کیا ہے کیا فسوں تو نے کہ دل تجھ سے نہیں پھرتا
برائی دل میں اے بیداد گر بہتیری آتی ہے

بجز خون دل محزوں بجز چشم و دل پرخوں
نہ پاس اپنے مے گلگوں نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے

ظفر جو خانۂ عالم میں ہم کو ایک مدت سے
نہ مستی کی ہوس ہے نے مے پرستی کی تمنا ہے

سجدہ بتوں کو کوئی نہ کرتا خدا پرست پر ان میں خوے بندہ نوازی ذرا سی ہے

ہم رہیں ساقی رہے اور دورِ پیمانہ رہے
حشر تک یارب یونہی آباد میخانہ رہے

جس طرح سے شمع پر پروانہ ہوتا ہے فدا
اس طرح سے شمع اس کے رخ پہ پروانہ رہے

جس کے سر پر ہو دے زیبا یار کے کوچے کی خاک
خاک اس کو آرزوے تاج شاہانہ رہے

میں وہ میکش اس چمن میں ہوں کہ ای ساقی مدام
مثل نرگس جس کے سر کے ساتھ پیمانہ رہے

تیغ قاتل کا ادا کب شکر ہوتا ہے ظفر
گو لب ہر زخم پر بسمل کے شکرانہ رہے

وہ دیکھ لیتے ہیں جو ادھر کچھ نہ کچھ تو ہے ہو جاتی دل کو دل کی خبر کچھ نہ کچھ تو ہے
وحشت ہے یا جنوں مجھے پر تیرے عشق میں پھرتا ہوں یوں جو خاک بسر کچھ نہ کچھ تو ہے
اتنے کشیدہ مجھ سے نہ ہو تم کہ آخرش دل کی مرے کشش میں اثر کچھ نہ کچھ تو ہے

تمام عمر گزاری ہے اپنی غفلت میں
جہاں کی سیر ظفر ہم نے خواب میں کی ہے
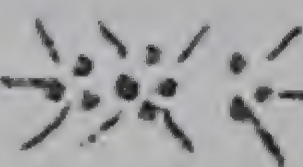
دیوان سوم

آگیا جب زباں پہ نام ترا
پھر زباں سے مزا نہیں جاتا
محو حیرت ہوں صورت تصویر
کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا

کوئی صنم اسے سمجھا کوئی خدا سمجھا
نہ سمجھے ہم کہ وہ کیا سمجھا اور یہ کیا سمجھا
ہمیشہ کیوں تری آنکھوں سے اشک جاری ہیں
ظفرؔ ہمیں بھی ذرا تو یہ ماجرا سمجھا

بلا سے گر نہ ہوا دل کا داغ گُل نہ ہوا
پر اپنے گھر کا یہ روشن چراغ گل نہ ہوا
کیا ہزار شگفتہ بہار نے لیکن
خزاں کے ڈر سے کبھی بافراغ گل نہ ہوا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ
آگے تو شعلہ سا کئی بار اٹھ کے رہ گیا

جائے گا دم میں دیار یار تک پیک خیال
ورنہ جو جائے گا وہ منزل بمنزل جائے گا
میں چمن میں بھی رہوں گا دل گرفتہ اے صبا
دل نہیں ہے میرا وہ غنچہ کہ جو کھل جائے گا

غلط ہے گریہ کیسے چپکے رہنا کچھ نہیں اچھا
نہ کہنے میں مزا ہے منہ سے کہنا کچھ نہیں اچھا

تم اس یار کا سہنے پہ سہنا اے دل اچھا ہے ولیکن بات کا غیروں کی سہنا کچھ نہیں اچھا

پھر گیا منھ ترا عقبیٰ سے کہ جب دُنیا نے
اک طمانچہ ہوس عیش و طرب کا مارا

رفیق راہ محبت کدھر گئے یا رب! کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا
سنا ہے جب سے کہ آتا ہے کوئی رشک بہار پھڑنگ غنچہ ہے دل اے ظفر کھلا پڑتا

کنارہ کش جو تو اے پر غرور ہم سے ہوا جتائی ہم نے محبت، قصور ہم سے ہوا
ہزاروں دل میں تھے مطلب ہمارے پر منھ سے بیاں نہ ایک بھی ان کے حضور ہم سے ہوا
ہم اس سے آپ رہے دور اپنی غفلت میں وہ اے ظفر نہ کسی وقت دور ہم سے ہوا

جز بادہ ہمیں بادہ پرستی میں نہ سوجھا کچھ سود و ضرر عالم مستی میں نہ سوجھا
جا بیٹھا ہے صحرا میں عبث شہر سے زاہد کیا سوجھے کا جنگل میں جو بستی میں نہ سوجھا
پستی میں جو دیکھا وہ بلندی میں نہ دیکھا سو جھا جو بلندی میں وہ پستی میں نہ سوجھا
نرگس کی روش آنکھ ظفر ہم نے جو کھولی اس گل کے سوا عالم ہستی میں نہ سوجھا

جہاں پہلے تھے ہم اب وہ مکاں پایا نہیں جاتا
اگر ڈھونڈیں نشاں اس کا نشاں پایا نہیں جاتا

جہاں ہے خوب وہی، ہے جہاں ہم کو سدا رہنا
مگر یاں وہ جہاں جا وداں پایا نہیں جاتا

پھرے بھٹکا نہ کیوں کر طائر دل بہرِ آسایش
کہ اس باغِ جہاں میں آشیاں پایا نہیں جاتا
کہو گے حالِ دل کیا ای ظفرؔ ان مہ جبینوں سے
کہ ان کا تو سراغ ای ہمرہاں پایا نہیں جاتا

وہ سیکھے بے طرح کچھ بیر کرنا
مجھے ڈر ہی الٰہی خیر کرنا!

دعا دو اپنی پیری کو بنے تم پارسا دیکھو
تمھاری وضع تھے ای ظفرؔ کیا تھی ہوا یہ کیا

نہ دل رکھا نہ جاں رکھی میں نے عشق میں
جو کچھ کہ ای ظفرؔ تھا مرے پاس کھو دیا

دیکھے عذاب سوزِ محبت میں اس قدر
دل سے ہمارے خوفِ جہنم نکل گیا
پھر خواب میں بھی وہ نظر آیا نہ ای ظفرؔ
آنکھوں کے سامنے سے جو عالم نکل گیا

مرگیا بیمار اس کی نرگسِ بیمار کا
دوستو اچھا ہوا اچھا ہوا اچھا ہوا!

یوں گم ہو جذبِ عشق کی تاثیر یا نصیب
اتنی ہو ان کے آنے میں تاخیر یا نصیب
تقدیر کے بگاڑ کی تدبیر کیا کریں
بنتی نہیں ہی کوئی بھی تدبیر یا نصیب
دل کو ہوئی نصیب نہ میرے شگفتگی
گا ہے بہ رنگ غنچہ تصویر یا نصیب

منعم و مفلس ہیں دونوں بزمِ ہستی میں خراب
مال مستی میں ہی وہ یہ فاقہ مستی میں خراب

یاں ترقی و تنزل سے مثالِ گرد و باد
گہ بلندی میں ہیں ہم اور گاہ پستی میں خراب

ہمارا اور عالم ہم کو اس عالم سے کیا مطلب
کسی سے کیا غرض ہم کو کسی کو ہم سے کیا مطلب
جو یہ سمجھے کہ ملتا ہے وہی جو کچھ ہے قسمت میں
رہا ان کو ظفر پھر فکرِ بیش و کم سے کیا مطلب

ناداں نہ ہو دکھلا کے کسی کو ہنر اپنا
تو ڈھانپ سکے عیب کسی کا تو ظفر ڈھانپ

آشنا کون رہا کس سے رکھیں ہم صحبت
نہ وہ ہمدم نہ وہ ہمدرد نہ وہ ہم صحبت
کرتے کس لطف سے آپس میں ہیں سرگوشی
شیشہ و جام میں ساقی رہے جم جم صحبت

ہم نہ ہیں مال کے محتاج نہ زر کے محتاج
ہیں فقط تیری عنایت کی نظر کے محتاج
یا کبھی رہتے تھے گلشن ہی میں یا مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا گل کی خبر کے محتاج

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا وہ مثلِ نقشِ پا
جو کہ مٹ جانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر

دن اور ہے رات اور زمیں اور زماں اور
رہتے ہیں زخود رفتہ جہاں ہے وہ جہاں اور
یک بار کیے نذر دل و جاں تیری دو توں
اب کیا تجھے دیں ہم کہ نہ دل اور نہ جاں اور
کچھ چشمِ تر اور سوزِ جگر پر نہیں موقوف
افسانۂ محبت کے بہت سے ہیں نشاں اور
محفل سے اٹھا غیر کو اور اس کے عوض تو
رکھ دے مری چھاتی پہ کوئی سنگِ گراں اور

نہ خبر لی مری اس بے خبری کو شاباش
مر گیا میں تری بے دادگری کو شاباش

کیا پرواز کی تکلیف سے آزاد مجھے
کہوں کس طرح نہ بے بال و پری کو شاباش

دل سے جاتا ہی نہیں تیرے ظفر اس کا خیال
خوب شیشے میں اُتارا ہی پری کو شاباش

گر سخن میں عشق کی گرمی نہیں
ای ظفر ہرزہ سرائی ہی فقط

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہی مجھے اپنے آشنا کا خوف

قسمت ہی مخالف ہی فقط عشق میں اپنی
نے یار مخالف ہیں نہ اغیار مخالف

کیوں وادیٔ وحشت میں نہ کھٹکا رہے مجھ کو
ہر جھاڑ ہی دشمن مرا ہر خار مخالف

ہو صلحِ کل ای دل کہ سب اٹھ جائے لڑائی
کافر نہ مخالف ہو نہ دیندار مخالف

برگشتہ زمانہ ظفر ایسا ہوا ہم سے
جو یار موافق تھے وہ ہیں یار مخالف

ہوئی غیروں کو خطا کی جو ہی تعزیر معاف
اس کا باعث بھی بتا دوں جو ہو تقصیر معاف

مدتوں تو نے دیے ہم کو جہاں میں چکر
اب تو رکھ کوئی دن ای گردشِ تقدیر معاف

کیا کیا تھے آشنا نہ رہا ایک بھی ظفر
افسوس سب کے سب ہوے بحرِ فنا میں غرق

وہم کی راہ نہیں ای دلِ آگاہ ہی ٹھیک
راہ جو صدق و صفا کی ہی وہی راہ ہی ٹھیک

دل گدا کا ہو جو دولت سے قناعت کی غنی
شاہ کیا بلکہ اُسے کہنا شہنشاہ ہی ٹھیک

جو برابر جانتے ہیں رتبۂ شاہ و گدا
اُن کے نزدیک اے ظفرؔ توقیر ہے دونوں کی ایک

سرشک آئے تو کب مژگان تر تک
کہ جب جل ہی گیا دل سے جگر تک

ہے یاں کی شیخ کشف و کرامت یہیں تلک
شیخی یہیں ملک ہے مشیخت یہیں تلک

لے کر گیا نہ یاں سے کوئی ساتھ ملک و مال
رہتی ہے یاں کی دولت و حشمت یہیں تلک

تو جا کے یاں سے پھر نہیں رہنے کا حکمراں
ہے تیری چند روز حکومت یہیں تلک

ظفرؔ بہار گلوں پر چمن میں ہے دو روز
رہے ہے رونق رخسار یار برسوں تک

بھرے انگاروں سے دم میں لالہ و گل کے چمن
اے ظفرؔ اتنی کہاں ہے بلبل شیدا میں آگ

غم و الم سے نجات پاؤں کہ بیش نہایت عذاب میں ہوں
بڑا ہی احساں کرے اگر تو کرے نہ اب اے قضا تامّل

ظفرؔ درنگ و شتاب میں ہیں نکلتے انساں کے کام لیکن
کرے وہ جلدی کی جائے جلدی کرے تامل کی جا تامّل

نہ خرد نہ ہوش نہ تدبیر پر شاکر ہیں ہم
دوستو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم
کرتے کیا کیا شکر کچھ ہوتا جو نالوں میں اثر
جب کہ اپنی آہ بے تاثیر پر شاکر ہیں ہم
ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی
رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم
ہے ظفر ہم سا جفاکش کون زیرِ آسماں
ہر جفائے آسمانِ پیر پر شاکر ہیں ہم

جوں بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم
اے دوستو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
یارو نہ روکو عشق میں رونے سے تم ہمیں
اس سے بجھاتے دل کی کچھ اپنے لگن ہیں ہم
ہیں گرچہ مثل شمع سراپا زباں تو کیا
کہہ سکتے پر زباں سے نہیں اک سخن ہیں ہم

کہتی ہے گردش تقدیر مجھے چین کہاں
خوب چکر تجھے جب تک تہ افلاک نہ دوں

بلا سے گرچہ ہوتا راز دل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں
ظفر ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

صنما ہم کہیں تو کیا کہویں
بخدا ہم کہیں تو کیا کہویں
مدعی کہنے ہی نہیں دیتے
مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں
نہیں فرصت جو کہئے حسرت دل
حسرتا ہم کہیں تو کیا کہویں
بن کہے ہی وہ اے ظفر ہم سے
ہے خفا ہم کہیں تو کیا کہویں

بستے تھے وہ جو لوگ یہاں کوئی بھی نہیں — خالی پڑے ہیں اُن کے مکاں کوئی بھی نہیں
دل سوز غیر سوز یہاں کوئی بھی نہیں — ہمدم سوائے آہ و فغاں کوئی بھی نہیں
میں دل کو جانتا تھا بڑا دوست عشق میں — دیکھا تو ایسا دشمن جاں کوئی بھی نہیں
شکووں سے یوں تو دل ہی لبالب مگر کبھی — آتا ہمارے تا بہ زباں کوئی بھی نہیں

تُوں کس کو اپنے ساتھ رفاقت میں اے ظفرؔ
صبر و شکیب تاب و تواں کوئی بھی نہیں

جگر سے میرے اگر ایک خار غم نکلا — چبھو دیے وہیں حسرت نے نیشتر دو تین

کہیے اپنا کسے اپنا تو کوئی ہی ہی نہیں — جو ہی بیگانہ ہمارا تو کوئی ہی ہی نہیں
وائے قسمت جسے ہم جانتے تھے دوست یہاں — جیسا دشمن ہی وہ ایسا تو کوئی ہی ہی نہیں
کیا کروں غم کو نہ سمجھوں اگر اپنا غمخوار — دل کے دینے کو دلاسا تو کوئی ہی ہی نہیں

قدرت حق کا تماشا ہی ظفرؔ جیسے بشر
ایسا دنیا میں تماشا تو کوئی ہی ہی نہیں

دل دے کے ہوا اس کو گنہ گار تو میں ہوں — دے کس کو سزا وہ کہ سزاوار تو میں ہوں
ہو کون کہ ایذا ہو جسے اپنی گوارا — ہوں اپنے اگر درپئے آزار تو میں ہوں
کہتا ہی مجھے عشق کہ تو غم سے ہراساں — کس واسطے ہی تیرا مددگار تو میں ہوں
بوسہ ترے لب کا مرض غم کی دوا ہی — کیوں اور کو دیتا ہی کہ بیمار تو میں ہوں

تُوں جان تلک بیچ کے مول اے ظفرؔ اس کو
ہوں جنس محبت کا طلب گار تو میں ہوں

آج تک معلوم یہ مجھ کو نہیں کیا چیز ہوں
کون ہوں کیا شے ہوں میں ناچیز ہوں یا چیز ہوں

ہو گیا دل میرا دولت سے قناعت کی غنی
جانتا دنیا کو میں کیا مال ہوں کیا چیز ہوں

کیا کہی بات ہم نے تم سے خلاف
روٹھ جانے کی باتیں اور ہی ہیں

ہم کہاں اور کہاں قفس صیاد
آب و دانے کی باتیں اور ہی ہیں

ظفر اگلا زمانہ تھا کچھ اور
اس زمانے کی باتیں اور ہی ہیں

گئی آہ جگر نہیں کی کہیں
جا ہی پہنچی خبر کہیں کی کہیں

میں کہوں بات تو وہ لے جائیں
جی میں کچھ سوچ کر کہیں کی کہیں

ہو گیا پردے سے کیا کہ پردہ نشیں
میری پہنچی نظر کہیں کی کہیں

میری وحشت لیے پھرے ہی مجھے
ان دنوں اے ظفر کہیں کی کہیں

واہ اس صورت کدے میں دیکھتے ہی دیکھتے
صورتیں کیا کیا نظر سے اپنی پنہاں ہو گئیں

نہ ہی بت خانے میں نہ کعبے میں ہے جو دل میں ہے
اور اگر دل ہی کے اندر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

غم ہے کیا ساقی کہ مستی کا نہیں کچھ اعتبار
تو دیے جا بھر کے ساغر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

خوبیٔ تقدیر کے ہیں ساتھ ساری خوبیاں
اور اگر اے دل مقدر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم
ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

خوبیٔ جوہر سے ہے انساں کی قدر و منزلت
اور اس میں خوب جوہر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

تم جو کہتے ہو ظفرؔ کو کچھ نہیں یہ آدمی
خیر بہتر بندہ پرور کچھ نہیں تو کچھ نہیں

نہ کبھی ہوں شاد شادی میں نہ غمگیں غم میں ہوں
میرا عالم اور ہے میں اور ہی عالم میں ہوں

بس میں دل کر لو کسی دم سے نہ پوچھو نہ کچھو
ہمیں کیا پوچھتے ہو ہم سے نہ پوچھو نہ کچھو

پوچھ لو دل سے ظفرؔ پوچھتے ہو جو تدبیر
اور کچھ مرہم عالم سے نہ پوچھو نہ کچھو

گالیاں دے چکے اب نالہ و زاری تو سنو
اپنی سب کہہ چکے تھوڑی سی ہماری تو سنو

نہ سنو تم مری توقیر کی باتیں نہ سنو
پر بلا سے مری تم ذلّت و خواری تو سنو

ناصحو حالِ غمِ عشق سنو تم کیوں کر
ہو وے حالت جو ہماری سی تمہاری تو سنو

اے ظفرؔ سنتے ہو کیوں باتیں کسی کی بے کار
کچھ اگر سننے سے ہو کار براری تو سنو

کہاں عیش مجھ کو نہ عیاش سمجھو
تم اس غم زدہ کو نہ بشاش سمجھو

ہنسی سے ہم نے زرا چھو لیے جو یار کے پانو
وہ اس نے کھینچے عجب ایک چیخ مار کے پانو
یہ تنگنائے جہاں ای ظفر نہیں وہ جائے
کہ سووے چین سے کوئی یہاں پسار کے پانو

ظفر وہ کون سا دانا جہاں میں ہے کہ جسے
اس آسیائے فلک نے نہیں مارا ہو

کیا کہوں بے دولتی و بدنصیبی اپنی ہیش
جب ہما پر ہاتھ ڈالا ہی تو زاغ آیا ہی ہاتھ
عشق کی دولت سے ہو کیوں کر نہ دل اپنا غنی
ملک وحشت ہاتھ آیا نقد داغ آیا ہی ہاتھ
ہاتھ دنیا سے اُٹھایا ہی جنھوں نے ای ظفر
رہتے ہیں وہ بافراغ ان کو فراغ آیا ہی ہاتھ

اس چمن میں کیا کروگے ای کشتہ ہنس بول کر
غنچہ ساں خاموش خوں دل کو پی کے ہو رہو
کرتے ہو برباد اپنی خاک بادے کیوں ظفر
اس کی خاک در غبار اس کی گلی کے ہو رہو

ہر جگہ ایک نیا رنگ ہی اللہ اللہ
واہ کیا جلوۂ نیرنگ ہی اللہ اللہ
تیرا اس میکدے میں ای بت سرمست غرور
کچھ عجب رنگ عجب ڈھنگ ہی اللہ اللہ
لب گل برگ سے لے تا بہ زبان ہر خار
سب پہ گلشن میں اک آہنگ ہی اللہ اللہ
برگ گل بھی تھا گراں جن کے تن نازک پر
ان کی چھاتی پہ دھرا سنگ ہی اللہ اللہ
چھوڑ کر اس بت کافر کے ظفر در کا طواف
آپ کو کعبے کا آہنگ ہی اللہ اللہ

ہم دیکھ چکے خوب تماشائے زمانہ اچھا ہو جو کچھ اور نہ دکھلائے زمانہ
کیا ہووے کوئی ساغر عشرت کا طلب گار خالی ہو مئے عیش سے پیمانۂ زمانہ
ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہر و محبت کس طرح کا آیا ہو ظفرؔ ہائے زمانہ

کہوں کیا جوش اشکوں کا معاذ اللہ معاذ اللہ
امنڈ آیا ہو اک دریا معاذ اللہ معاذ اللہ
جگر تو دیکھ تو میرا نہ کی اک آہ بھی میں نے
کیے تو نے ستم کیا کیا معاذ اللہ معاذ اللہ
کیا غارت ہزاروں کو ظفرؔ دنیا کی دولت نے
بڑی آفت ہو یہ دنیا معاذ اللہ معاذ اللہ

دل کو وہ رنج دے آمین اللہ اور یہ سب سہے آمین اللہ
جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفرؔ عوض اس کا ملے آمین اللہ

ہوں کس سے بے مہریاں اس فلک کی کہ سب اٹھ گئے مہرباں اچھے اچھے
لڑیں کیا زمانے سے کشتی کہ اس نے پچھاڑے بہت پہلواں اچھے اچھے
ظفرؔ ہو وہ گرمی تمھارے سخن میں کہ جلتے ہیں آتش زباں اچھے اچھے

طاقت نہیں پھرنے کی عادت لیے پھرتی ہو یا صرف مجھے میری ہمت لیے پھرتی ہو
خورشید صفت مجھ کو ہو شوق جہاں گردی طالع لیے پھرتے ہیں قسمت لیے پھرتی ہو
کیا جانے ظفرؔ کس کو یہ بھیس میں آہو کے صحرا میں ان آنکھوں کی وحشت لیے پھرتی ہو

جو دل پہ ہو گزرتی کچھ دل ہی جانتا ہے بتلاؤں اے ظفر کیا اس دل کا حال کیا ہے

ظفر کہتے ہو کیا دل کی حقیقت کسی محرم سے جو گزرے سو گزرے

آئے وہ جب کہ کہہ نہ سکے کچھ بھی ان سے ہم
حسرت سے اک نگاہ فقط کر کے رہ گئے

نہیں ہے کس میں اسے دیکھ لو سبھی میں ہے کہ لے کے عرش سے تا فرش وہ سبھی میں ہے
سکھائی ماہ وشوں کو جو اس نے بے مہری تو اب سبھی میں یہ عادت ایہ خو سبھی میں ہے
ظفر یہ بھید ہے کیا جانے کیا نہیں کھلتا
کہ ڈھونڈتے ہیں سبھی اس کو جو سبھی میں ہے

نہ ہو نصیب میں صحت تو کیوں کر ہو صحت مگر طبیب نے میری دوا بری تو نہ کی
بتوں نے کی جو بھلی ہم سے وہ بھلی ہی سہی پر اُن سے ہم نے بھی شکر خدا بری تو نہ کی
ظفر بھلائی میں دی اس کی تو نے جاں اپنی
صد آفریں تجھے صد مرحبا بری تو نہ کی

جو تیری یاد جلوۂ قامت میں سو گئے گویا وہ عرصۂ گہ قیامت میں سو گئے
اُن غافلوں نے دیکھا تماشا جہاں کا کیا جو مست ہو کے نشۂ دولت میں سو گئے
ہم سوتے زیر خاک نہ آرام سے مگر جاگے بہت تھے رنج و مصیبت میں سو گئے

جتنے جگائے فتنۂ خوابیدہ حرص نے سب آکے میرے کنج قناعت میں سو گئے

سوئے ہزار فتنے قیامت کے اک ظفر
اہل دول جو نشۂ دولت میں سو گئے

ظفر جو ہو گئے ہیں آشناویں کی لطافت سے
لگائیں منہ وہ کیا دنیا کو یہ آخور دنیا ہی

ہمیں میں رنج بھی ہی اور راحت بھی ہمیں میں ہی
جہنم بھی ہمیں میں اور جنت بھی ہمیں میں ہی

کہیں مشہور ہم عاقل کہیں بدمست لا یعقل
کہ ہشیاری بھی ہم میں اور غفلت بھی ہمیں میں ہی

ہمارے پاس جوں دریا دُر و خرمہرہ دونوں ہیں
کہ بے ہمت بھی ہم ہیں اور ہمت بھی ہمیں میں ہی

نہیں غیر از صلاح و خیر داں تو اور کچھ ہرگز
ظفر شر بھی ہمیں میں ہو شرارت بھی ہمیں میں ہی

صورت اس بت کی کسی جا ہمنشیں دیکھی تو تھی
دیر میں کعبے میں یا دل میں کہیں دیکھی تو تھی

شکست شیشۂ دل کیا کہوں کہ اک آواز ترے بھی کان میں ای دل شکن گئی ہوگی

ظفرؔ کھوئے دل سی چیز اپنی بے خودی میں ہم
خدا جانے کہ کس کو دی کدھر پھینکی کہاں چھوڑی

نہ ہوگی اے عزیزو ایسی مے خواری میں بے ہوشی
ہمیں جیسی رہی ہے عین ہشیاری میں بے ہوشی
دل بیدار اپنا کیا دیدۂ بیدار سے حاصل
مرے نزدیک ہے غافل وہ بیداری میں بے ہوشی

ظفرؔ اس عالم پیری میں تیرے وہ ارادے ہیں
کہ جن میں تھک کے رہ جاتی جوانوں کی جوانی ہے

کیا وہ اس دور میں ساغر مے عشرت سے بھرے
کاسۂ عمر کو جو لاکھ مصیبت سے بھرے

ظفرؔ آنکھیں کہے دیتی ہیں تیری کیا چھپاتا ہے
مئے الفت کی کیفیت چھپائے سے نہیں چھپتی

اے ظفرؔ کچھ فکر واں کا کر یہاں تو چند روز
زندگانی ہے بہر صورت بسر ہو جائے گی

خوش رہتے ہیں مشغول جو ہیں حرص و ہوا میں
اپنے تو حواس اڑاتے ہیں دنیا کی ہوائیں

کھاتی ہمیشہ غم ہی لہو پیتی جان ہے — کس طرح سے نہ کھلئے پیے جیتی جان ہے

جب کوئی بات درد محبت کی چل پڑی — آنسو کی بوند آنکھ سے اپنی نکل پڑی
میں ہوں وہ خود گرفتہ مری شکل دیکھ کر — تلوار تیرے ہاتھ سے قاتل اگل پڑی
زہار وقیس کا تو ظفرؔ شہرہ ہو چکا — اب اپنی دھوم جانب دشت و جبل پڑی

نہ فقیری چاہیے نہ بادشاہی چاہیے — قسمت اچھی چاہیے فضل الٰہی چاہیے

خدا بچائے ظفرؔ دوستی سے اس دل کی — جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ تو بت خانے سے ہے کام کچھ اے حضرتِ دل
اور نہ مطلب ہے حرم سے تمھیں کیا بھاتا ہے
غافلو سیکڑوں ہستی میں تماشے ہیں کہو
تم جو یاں آئے عدم سے تمھیں کیا بھاتا ہے

کی ہے جس نے یار کے در کی گدائی اختیار
بادشاہی ہے تمام اس پر امیری ختم ہے

سر پہ اپنے رکھ کے نعلین رسول مجتبیٰؐ — شکر اللہ اے ظفرؔ ہم تاج داروں میں ملے

مجھے کہتے ہیں دیکھ کر بعضے بعضے — کہ ہوتے ہیں ایسے بشر بعضے بعضے

ظفرؔ دوست داراب جہاں میں کہاں ہی غنیمت سمجھ ہیں اگر بیٹھے بیٹھے

جلتے ہیں اہلِ دنیا جیسی پڑھتے ہیں نماز پر بلا سے سرکشوں کا سر ذرا جھکتا تو ہی

نہیں معلوم دل کا باعثِ رنج و قلق کیا ہی
اور اس رنج و قلق سے دیکھیے منظورِ حق کیا ہی
دیا پیغام جو قاصد نے تجھ کو ہم سے تو کہہ دے
ظفرؔ کیوں ہو گیا سنتے ہی تیرا رنگ فق کیا ہی؟

کوچۂ حرص میں سے جائے نہ انساں کو خدا کہ وہاں تو سگِ دنیا ہیں بھنبوڑے کھاتے
ٹانکے پیراہن تن کے مرے فرقت میں تری روش مور چگاں ہیں مجھے توڑے کھاتے

بن آتی وہاں کچھ نہیں ایسی ویسی جو چاہو سو کر لو یہیں ایسی ویسی
غنیمت ہی مل جائے مدفن کو میرے اگر اس گلی میں زمیں ایسی ویسی
بتا کیا کریں ہم اگر دل پہ گزرے محبت میں ای ہم نشیں ایسی ویسی
زیادہ ہی برّش میں تیغ اجل سے نہیں تیری شمشیر کیں ایسی ویسی
خدا کے لیے ای ظفرؔ ان کے آگے نہ کہہ بیٹھیو تو کہیں ایسی ویسی

وہ بیٹھے ہیں خفا کیا جانے کیا ہی کسی نے کہہ دیا کیا جانے کیا ہی
محبت کی حلاوت ہم سے پوچھو کوئی اس کا مزا کیا جانے کیا ہی
نگہ تیری کوئی برق بلا ہی کہ ہی تیغ قضا کیا جانے کیا ہی

ظفر ہو خاک کا پتلا یہ انساں پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہو!

وہ جھوٹ سے جو زمیں آسماں ملادیں گے
تو پاس جتنے ہیں سب ہاں میں ہاں ملادیں گے
نہ پائے گا کوئی ہم کو بہ رنگ نقش قدم
ہم ایسا خاک میں اپنا نشاں ملادیں گے
بتوں سے ملتے ہو جھک جھک کے کیوں ظفر اتنا
یہ کیا خدا سے تمھیں مہرباں ملادیں گے

کیا اور اس سے ہوگا زمانے کو انقلاب جو بات عیب کی تھی ہنر ہوگئی تو ہو

نہ بھرو دم بہ دم ظفر آہیں چپ رہو کوئی دم خدا کے لیے

جمالِ گل رخاں دیکھو عجب شانِ الٰہی ہو جدا ہو رنگ ہر گل کا عجب شانِ الٰہی ہو
کیا شکوہ نہ ہم نے اس صنم کا اس نے جب پوچھا کہا الحمد للہ شکر احسانِ الٰہی ہو

دیوان چہارم

تابشِ خورشیدِ محشر کا مجھے کیا غم ظفر بیٹھنے والا ہوں کس کے سایۂ دیوار کا

اچھا گیا گر ہم کو بُرا جان کے چھوڑا
پر حیف کہ غیروں کا کہا مان کے چھوڑا

وہ ابھی ہم پر جفا کرتا ہی کیا
آگے آگے دیکھنا کرتا ہی کیا

تجھ پہ کرتا ہی جو کوئی جاں فدا
تو ہی منصف ہو برا کرتا ہی کیا

دل ہزاروں روز لے جاتا ہی تو
یہ بتا ای دل رُبا کرتا ہی کیا

اب تو دل اس بت کو ہم نے دے دیا
ای ظفر دیکھیں خدا کرتا ہی کیا

طوفاں بپا یہ گریے کی شدت نے کیا کیا
مجھ کو ڈبو دیا غم الفت نے کیا کیا

مجھ سے جو کچھ کیا سو محبت نے آپ کی
ای مہرباں کسی کی عداوت نے کیا کیا

اس بے وفا پہ تجھ کو کیا مبتلا ظفرؔ
مجھ سے سلوک یہ مری قسمت نے کیا کیا

کہاں تک چپ رہوں چپکے رہے سے کچھ نہیں ہوتا
کہوں تو کیا کہوں اُن سے۔ کہے سے کچھ نہیں ہوتا

شگفتہ ہو گُل و بلبل سے تجھ بن کیا چمن میں دل
ہنسی سے اس کی اُس کے قہقہے سے کچھ نہیں ہوتا

نہیں ممکن کہ آئے رحم اِس کو ای ظفرؔ مجھ پر
سہوں اس کے ستم کیا میں سہے سے کچھ نہیں ہوتا

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمھاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

ہائے کمبخت کسے یہاں اپنا
کون اپنا ہی اور کہاں اپنا

ہو وہ جانِ جہاں نہ ہرگز دوست — اور دشمن ہو اک جہان اپنا
ہم ہوے پیر اے ظفرؔ لیکن — دل ہے اب تک وہی جوان اپنا

کھٹکتا خارِ غم کا چین اک دم بھر نہیں دیتا
نکالوں چیر کر دل پر کوئی نشتر نہیں دیتا
پڑا میں کروٹیں لیتا ہوں ساری رات بستر پر
زرا آرام سے سونے دلِ مضطر نہیں دیتا

ظفرؔ رہا وہ بشر خوب اول و آخر — جو خاک سمجھے ہوا خاکسار پہلے ہوا

لگا ہوا ہے ہمارے دم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا
چھٹے گا تا زندگی نہ ہم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا
یہ جانو اپنی ظفرؔ کہانی کہی ہے اوروں کی داستاں میں
ہوا اگر اس اسیرِ غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا

جب کہ ہستی میں عدم سے یہ بشر آ ہی گیا — جو پسِ پردہ تھا وہ پیشِ نظر آ ہی گیا
ہوئی تقسیم ازل سے جو مری آتشِ دل — کوئی دوزخ کے بھی حصے میں شرر آ ہی گیا
دست بردار ہوں کیا دل برِ سنگیں دل سے — ہاتھ پتھر کے تلے اب تو ظفرؔ آ ہی گیا

خاک اڑانی تھی اڑائی ہم نے مثلِ گردباد — نے بلندی میں اٹھایا کچھ نہ پستی میں مزا

ظفرؔ کی سیر اس گلشن کی ہم نے پر کسی گل میں
نہ کچھ الفت کی بو پائی نہ کچھ رنگ وفا دیکھا

مست مئے پندار ہیں یہ مردم دنیا
بھولے سے بھی ای دل انھیں ہشیار نہ کہنا

ہم نے بھی کیا عہد کہ درد دل بے تاب
مر جانا مگر تجھ سے ستم گار نہ کہنا

چپکے سے مرا خط انھیں دے دیجیو قاصد
کچھ منھ سے خبردار خبردار نہ کہنا

عزیزو کام نہ کس کس کا یاں بنا بگڑا
ہمارے پیش نظر اک جہاں بنا بگڑا

رہی نہالِ چمن ہی سے الفت ای صیاد
ہزار بار مرا آشیاں بنا بگڑا

ہر ایک دیک سے لیتا جہان کا بدلا
جنھوں نے رنگ مری عز و شان کا بدلا

نے ہم ہیں شاہ دوست نہ ہم ہیں وزیر دوست
پر اُن کے دوست دار ہیں جو ہیں فقیر دوست

دشمن بھی کیا ہیں چشم حقارت سے دیکھتے
رکھتا ظفرؔ نظر میں ہی ہم کو حقیر دوست

طاقت و ہوش ہوے ہم سے جدا اچھے وقت
دی بڑھاپے میں ہمیں سب نے دغا اچھے وقت

دم ناک میں ہمارا یہ لاتے ہیں بے ہنر
یارب کرم سے تو کسی صاحب ہنر کو بھیج

غم خانۂ دنیا میں ہی جینے کا مزا ہیچ　　اس بے مزگی پر کوئی جیتا ہی تو کیا ہیچ

ہر شی میں ہو تو جلوہ نما واحد و شاہد　　اللہ ترا جلوہ ہی کیا واحد و شاہد
سب رنگ ترے اور ترا رنگ نرالا　　تو سب میں ہی اور سب سے جدا واحد و شاہد
پردے کو دوئی کے جو در دل سے اٹھایا　　بے پردہ تجھے دیکھ لیا واحد و شاہد

کیا بڑھاپے میں کریں بادہ پرستی کی ہوس
گئے مستی کے وہ دن ہو چکی مستی کی ہوس

خاک ہو بیٹھیں انھیں جن کو بگولے کی طرح
گہ بلندی کی ہو خواہش گہے پستی کی ہوس

ہم وہ آوارہ و سرگشتہ ظفر ہیں کہ ہمیں
نہ تو ویرانے کی پروا ہی نہ بستی کی ہوس

شمع سے گل گیر کیا ہو تاج زر کی احتیاط　　عشق میں اس سے نہ ہو جب اپنے سر کی احتیاط
سیکڑوں محتاط ہو کر دختر رز سے خراب　　کھو گئے اس میکدے میں عمر بھر کی احتیاط
ای ظفر سینے میں بھڑکا اپنے شعلہ عشق کا　　ہو چکی دل کی حفاظت اور جگر کی احتیاط

تجھ بن شراب عیش کے پینے پہ چار حرف　　اور اس طرح کے بے مزہ جینے پہ چار حرف
لا ایک حرف شکوہ زباں پر نہ چرخ کا　　بھیج اس ستم شعار کمینے پہ چار حرف
الفت کی شرح سے ہیں بیاضیں بہت سیاہ　　پھیلے ہیں یہ ہزار سفینے پہ چار حرف
روز ازل سے نام محمدؐ کے ای ظفر　　کندہ ہیں اپنے دل کے نگینے پہ چار حرف

حضرت دل کیا کرتے ہو شکوہ اس سے آنکھیں دکھانے کا
اُف نہ کرو تقدیر میں جو کچھ دیکھنا ہی سو دیکھو تم

وہی ہی جانِ جہاں اس جہاں کے پردے میں
کہ کر رہا ہی ستم آسماں کے پردے میں
ظفرؔ زمانے کی نیرنگیوں نے کیا کیا رنگ
دکھائے ہم کو بہار و خزاں کے پردے میں

دل مضمحل ہی کیا اسے خنجر سے چھیڑ دوں
اتنا بھی دم نہیں ہی کہ نشتر سے چھیڑ دوں
بہتر ہزار تذکرے سے ہو وہ اے ظفرؔ
کچھ ذکر شاعری جو سخن ور سے چھیڑ دوں

گرد ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں
خاک ہوں خاکسار ہوں کیا ہوں
نہیں معلوم لاغری سے میں
رگِ گُل ہوں کہ خار ہوں کیا ہوں
جوں نگیں اتنی سینہ کاوی سے
میں اگر نام وار ہوں کیا ہوں
اتنا ہوں ہوشیار غفلت میں
میں اگر ہوشیار ہوں کیا ہوں
جاں نثاری سے اپنی شاد ظفرؔ
میں جو اس پر نثار ہوں کیا ہوں

میں کہوں کیوں کر کہ شوق وصل یار اصلا نہیں
کچھ تو ہی جس سے مرے دل کو قرار اصلا نہیں
شکر بارے سرگراں مجھ سے نہیں ہی کوئی یار
میں کسی کی خاطرِ نازک پہ بار اصلا نہیں

ای ظفر تو شوق سے پی ساغرِ صہبائے عشق	اس شراب ناب میں رنج خمار اصلا نہیں

گل گلزار ہوں تو یاں پیش ہوں	اور اگر خار ہوں تو یاں پیش ہوں

میرا غمخوار ہے تو دل میرا	دل کا غمخوار ہوں تو یاں پیش ہوں

جتنے بدبیں ہیں ان کی آنکھوں میں	ای ظفر خار ہوں تو یاں پیش ہوں

کیا عجب مجھ پہ سنگ باری ہو	نخل پُر بار ہوں تو یاں پیش ہوں

ستم گر دیکھ تو ہم تجھ سے کس الفت سے ملتے ہیں
اس الفت کے جہاں میں آدمی قسمت سے ملتے ہیں

تصور میں کبھی تصویر ان کی دیکھ لیتے ہیں
اب اُن سے ہم جو ملتے ہیں تو اس صورت سے ملتے ہیں

گلے کی خواہشیں اپنی وگرنہ تجھ سے تو	ستم کی تیغیں ہیں ظالم نصیب کی سی ہیں

ظفر ڈر اُن سے کہ ہیں جن کے شیطنت دل میں	اور اُن کی باتیں بہ ظاہر غریب کی سی ہیں

ایک ہو تو کہیے ہیں دنیا کے دھندے سیکڑوں
اور ہر دھندے میں ہیں آفت کے پھندے سیکڑوں

ایک ہی اس کے ستم سے اس قدر گھبرا گیا
ایسے ایسے ہوں گے ای دل بعد چندے سیکڑوں

اس کی وہ بندہ نوازی ہو کہ جس سے ای ظفر
ہو گئے اک چیز ہیں ناچیز بندے سیکڑوں

خدا جانے کہ ہم دل سوختہ کیا کیا کہیں لیکن
زباں اپنی نہیں جوں شمع محفل اپنے کہنے میں

گئے نا آشنا اور آشنا ہم کس کو کہہ بیٹھیں | بُرا ہم کس کو کہہ بیٹھیں بھلا ہم کس کو کہہ بیٹھیں
کسی کو کیوں کہیں کچھ ہم اگر کہنا ہو کچھ ہم کو | تو قسمت کو کہیں اس کے سوا ہم کس کو کہہ بیٹھیں
نہیں یاں زاہد و مُلّا تو بہتر ہے کہ کچھ منھ سے | خدا جانے نشے میں ساقیا ہم کس کو کہہ بیٹھیں

بُرا وہ ہے حقیقت میں جو سمجھے آپ کو اچھا
بُرے سب سے ظفر ہم ہیں بُرا ہم کس کو کہہ بیٹھیں

بے راہ نما تنہا جائیں تو کدھر جائیں | معلوم نہیں رستا جائیں تو کدھر جائیں
نے دین کی خواہش ہے نے کفر سے کچھ مطلب | ہم دونوں سے بے پروا جائیں تو کدھر جائیں
رنج و الم و غم نے اندوہ نے حسرت نے | ہے آکے ہمیں گھیرا جائیں تو کدھر جائیں
صحرائے محبت میں خار غم فرقت کا | ہے چار طرف کھٹکا جائیں تو کدھر جائیں

دنیا کی ظفر آکر ہم بھول بھلیّوں میں
ہیں بھول گئے رستا جائیں تو کدھر جائیں

حال نہیں کچھ کھلتا میرا کون ہوں کیا ہوں کیسا ہوں
مست ہوں یا ہشیاروں میں ہوں ناداں ہوں یا دانا ہوں
کان سے سب کی سنتا ہوں اور منھ سے کچھ نہیں کہتا ہوں
ہوش بھی ہے بے ہوش بھی ہوں کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں
کیسا رنج اور کیسی راحت کس کی شادی کس کا غم
یہ بھی نہیں معلوم مجھے میں جیتا ہوں یا مرتا ہوں

کارِ دیں کچھ بن نہیں آتا دعوا ہی دینداری کا
دنیا سے بیزار ہوں لیکن رکھتا خواہش دنیا ہوں
یار ہی میرے دل میں اور میں کعبے میں بُت خانے میں
گھر میں وہ موجود ہی اور میں گھر گھر ڈھونڈتا پھرتا ہوں
کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہوں گر دیکھو چشم حقیقت سے
میں ہوں ظفر مسجودِ ملائک گرچہ خاک کا پتلا ہوں

ہوئی جس سبب ہم سے تم سے جدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بیاں یہ تو کر دے گی ساری خدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
یہ مشہور ہی دل سے ہی راہ دل کو، کیا کرتا ہی دل ہی آگاہ دل کو
وہ دل ہی سے پوچھو جو ہی دل میں آئی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
ہمیں چاہو تم اور ہم تم کو چاہیں، اُدھر تم نباہو اِدھر ہم نباہیں
سوا اس کے رسم و رہِ آشنائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
پہیلی سی اک رمز مہر و وفا ہی، اسے پوچھتا ہی تو دل بوجھتا ہی
نہیں جاتی یہ منھ سے ہرگز بتائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بلا سے کوئی گر بھلا یا بُرا ہی ہمیں کیا غرض اور تمھیں کام کیا ہی
ظفر اب کسی کی بُرائی بھلائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

خط و پیغام کی واں بات تو کچھ ہی ہی نہیں — قاصدا امید ملاقات تو کچھ ہی ہی نہیں
ہم خوش اوقات بد اوقات بتائیں کس کو — اپنی اے دوستو اوقات تو کچھ ہی ہی نہیں
ہوتا ہی آپ کے انداز سے مطلب معلوم — ورنہ بندے میں کرامات تو کچھ ہی ہی نہیں

بندۂ بادشاہ مطلق ہوں گرچہ رکھتا ہوں تاج زر، ہوں کون
وہ جو کہتا ہی مجھ کو کون ہی یہ آنا بے دید کو نظر ہوں کون
کوئی پہچانتا بھی ہی مجھ کو
شاہ ہوں یا گدا ظفر ہوں کون؟

زاہد نہ بادہ نوش ہوں نی مے پرست ہوں
رہتا شراب عشق ہی سے خوب مست ہوں
یہ نفس کافر اور بھی کرتا ہی سرکشی
ہر روز اس حریف کو دیتا شکست ہوں
ہستی کے مے کدے میں ظفر کب ہوا سرور
روز ازل سے مست شراب الست ہوں

رکھیں گے ہم بھی فلک سے خوشی کی پھر امید کسی کو شاد تہ آسمان دیکھ تو پائیں
ظفر امید وفا ایسے بے وفاؤں سے! گیا ہی وہم کدھر کس خیال میں تم ہو؟

مانند نکہت گل عمر اپنی اس چمن میں کی جس طرح سے ہم نے برباد کچھ نہ پوچھو
احوال دل ظفر کا کیا پوچھتے ہو پیارے کیا جانے شاد ہی یا ناشاد کچھ نہ پوچھو

لکھا نصیب کا ہی کہ لکھوائے اُن سے غیر جب کچھ کرو کسی کو رقم ہم سے پوچھ لو
ہم جانتے ہیں جس لیے روتے ہو تم ظفر یہ ماجرائے دیدۂ نم ہم سے پوچھ لو

کشتۂ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل جل کر
کردیں اگر اک حشر بپا کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو!
یہ جو پڑا ہی پردہ غفلت اپنے دیدۂ دل پہ ظفر
کوئی اگر دے اس کو اٹھا کیا اچھا ہو کیا اچھا ہو!

کیا ہی ہما ہمی ہی بتوں کو بھی ای ظفر
کہتے ہیں یہ جہاں میں ہمیں ہوں کوئی نہ ہو!

کیمیا تقدیر ہی کو اپنی سمجھو ای ظفر
کرتے ہو کیوں جستجو اکسیر کی توبہ کرو!

گو تم نے خفا ہو کے نہیں بات کہی کچھ
پر دل میں تمھارے خفگی ہی تو سہی کچھ
جس کے کلہ فقر ظفر سر پہ ہی زیبا
وہ مال سمجھتا ہی نہیں تاج شہی کچھ

کیوں شاہد اپنے حال کے ہم ڈھونڈیں ای ظفر
یہ ہی جو بے کسی یہی اپنی گواہ ہی

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبے کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

غم کو چھوڑوں کیوں کہ میں گر آشنا ہی تو یہی
اب برا ہی تو یہی ہی اور بھلا ہی تو یہی
میں نے اس قاتل سے پوچھا آج کیا دل میں ترے
قتل کا میرے ارادہ ہی - کہا ہی تو یہی

بانی حقیقت دل دریا ہی کہیا اُسے
جو موج جستجو میں سدا تیز دوستی ہی

ہمیں مستی سی ہر صہبا کی رہتی نہیں بالکل خبر دنیا کی رہتی
نہ پوچھو ماجرا اشکوں کا میرے روانی سی ہی اک دریا کی رہتی
تڑپتا ہی مثال مرغ بسمل یہ حالت ہر دل شیدا کی رہتی

شوقِ پابوس میں ہم دور سے دوڑے آئے
چومنے کو یہ قدم دور سے دوڑے آئے
صید افگن جو ہوا وہ صنم کافر کیش
سیکڑوں صید حرم دور سے دوڑے آئے
جب رہا پاس ظفر کوئی نہ اپنے غم خوار
سنتے ہی حضرت غم دور سے دوڑے آئے

نہ طلب ہی دیں کی ہم کو نہ ہیں دنیا ڈھونڈتے
ہم خدا جانے ہیں طالب کس کے اور کیا ڈھونڈتے
جو تماشا دیکھ کر محو تماشا ہم ہوے
کیا تماشا ہر وہی ہیں ہم تماشا ڈھونڈتے

جان میری تن میں ای قاتل تڑپتی چھوڑ دی
اور اک تونے نہ کیوں تیغ دو دستی چھوڑ دی
خود پرستی بت پرستی سے نہیں کم ای ظفر
جس نے چھوڑی خود پرستی بت پرستی چھوڑ دی

یہ نقشہ ہو گیا ہے میرا سودائے محبت میں
مری صورت مرے یاروں سے پہچانی نہیں جاتی
طبیعت ہے جواں پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری
سخن فہمی سخن سنجی سخن دانی نہیں جاتی

ظفر اس بحرِ فنا میں کوئی دم کشتیٔ عمر اور زیرِ فلک پیر ہے چلتی پھرتی

ہم نے دیکھے عجب اس بحرِ جہاں کے دھوکے
وے ہیں یاں ریگِ رواں آبِ رواں کے دھوکے
سچ ہے دنیا کو اگر دھوکے کی ٹٹی کہیے
اے ظفر کھلتے کسی پر نہیں یاں کے دھوکے

کرتا پیدا عالم آرا عالم میں سے عالم ہے
عالم کو دکھلاتا اپنا عالم میں سے عالم ہے
کس کس کا افسوس کریں ہم آگے سے ان آنکھوں کے
اُٹھ گیا اے دل دیکھا کیا کیا عالم میں سے عالم ہے
آئے عدم سے ہستی میں ہستی سے عدم کو جاتے ہیں
رکھتا کیا ہی سیدھا رستا عالم میں سے عالم ہے
ہر دم ایک نیا ہی عالم دیکھتے ہیں عالم میں ہم
دیکھ ظفر کیا پیدا ہوتا عالم میں سے عالم ہے

زباں پر اس بُتِ بے مہر کا گر نام آتا ہی
خدا جانے یہ ہی کیا، دل کو اک آرام آتا ہی

ہم کہاں اور کہاں خانۂ رنگینِ جہاں دیکھ لیں اور کوئی دم ہی تماشا باقی

دوست اپنے ہوے ظفر دشمن اس مصیبت کو کون پہچانے

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

بول اٹھا تیرے آگے جو غنچہ پٹاق سے مارا صبا نے منھ پہ طمانچہ تڑاق سے
صحبت منافقانہ ہی ہر جا نفاق سے کچھ اتفاق ہی تو کہیں اتفاق سے
دیکھا نہ تجھ کو ہم یونہی محروم ہی چلے آئے تھے تیری دید کو کس اشتیاق سے

وصلِ جاناں میں جو تھے عشرت کے وہ دن ٹل گئے
آ گئے دن رنج کے راحت کے وہ دن ٹل گئے
ضعفِ پیری کا بُرا ہی کھو دیا سب کار سے
اب رہی طاقت کہاں طاقت کے وہ دن ٹل گئے
اب تو خونِ دل ہی ہم پیتے ہیں حسرت میں مدام
بادۂ عیش و مئے عشرت کے وہ دن ٹل گئے
اب تو بیزاری ہی ساقی دخترِ رز سے ہمیں
اس سے رغبت کیا کریں رغبت کے وہ دن ٹل گئے

عہد پیری میں کہاں جوش جوانی کی اُمنگ
ای ظفرؔ افسوس کیفیت کے وہ دن ٹل گئے

کیا ہمیں حشمت شاہی سے محبت ہووے
ای ظفرؔ ہم تو فقیروں سے ہیں الفت رکھتے

محبت میں گو لاکھ صدمے ہوں دل پر
ظفرؔ کچھ نہ نکلے خبردار منہ سے!

کس نے لب مے گوں کی ظفرؔ یاد ہی تم کو
یوں لب سے لگائے جو لب جام ہو بیٹھے؟

میرے نزدیک ظفرؔ بادہ پرستی اچھی
پر نہیں ہی مئے پندار کی مستی اچھی
ہی جنھیں ہوش ظفرؔ رہتے ہیں دنیا سے الگ
کہ نہیں الفتِ مے خانۂ ہستی اچھی
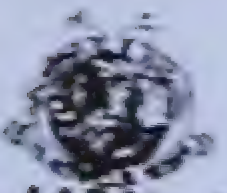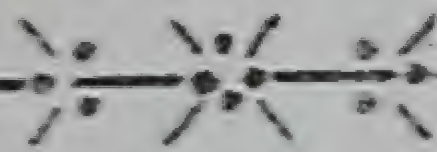
ALLAMA IQBAL LIBRARY
30333
JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No 30333
Date. 13.11.59.
SRINAGAR
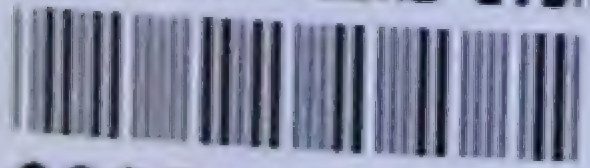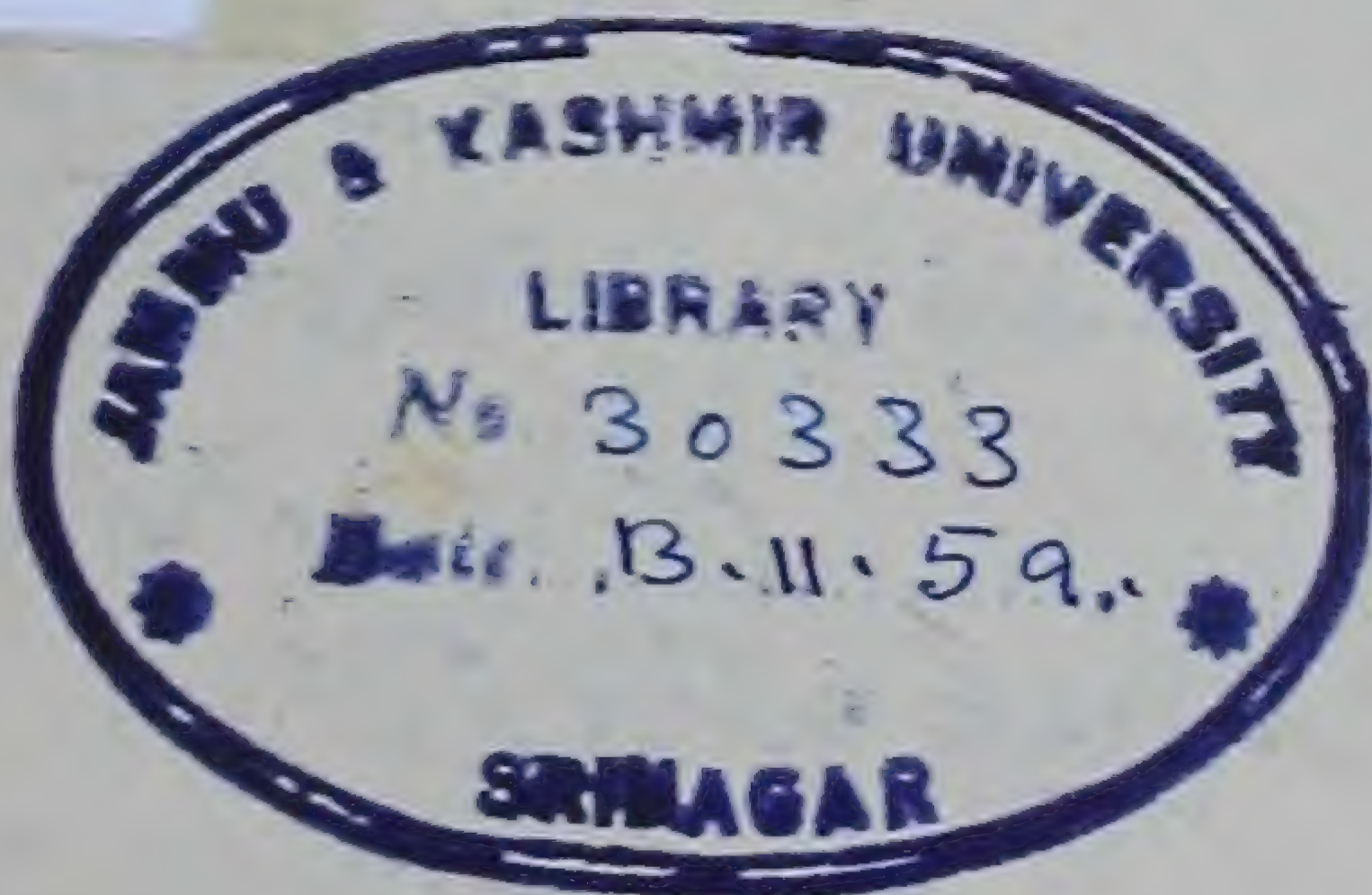
ہماری زبان

انجمن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

چندہ سالانہ ایک رُپیہ قیمت فی پرچہ ایک آنہ

اُردوٗ

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہی

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہی۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردوٗ میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہی۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زائد ہوتا ہی۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات رُپے سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا ماہانہ رسالہ

ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہی

اس کا مقصد یہ ہی کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو دانوں میں مقبول کیا جائے دُنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں ہورہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہی اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہی۔ اس سے اُردوٗ زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہی۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)

خط وکتابت کا پتا:۔ معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن)

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ (ہند) دہلی

جگ بیتی

یہ مثنوی اُردو کے مشہور ادیب و شاعر جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صا
کی جدید تصنیف ہے۔ ساری مثنوی میں کہیں اضافت نہیں آئی۔
قیمت مجلد چودہ آنے (۱۴؍) بلا جلد آٹھ آنے (۸؍)

فنِ شاعری

"بوطیقا" فنِ شاعری پر ارسطو کی تصنیف (POETICE) بوطیقا کا اُردو تر
جناب عزیز احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے سلیس اُردو زبان میں کیا ہے
قیمت مجلد ایک روپیہ دس آنے (عہ؍) بلا جلد ایک روپیہ چار آنے (عہ؍)

عرفانیاتِ فانی

صہبائے غزل کے ساقی حضرت شوکت علی خاں فانی بدایونی کا اُردو کلیات
قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے (عہ؍) بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ؍)

مینیجر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبرا دریا گنج۔ دہلی